God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is a translation with some additions of the famous Urdu book of Maulana Wahiduddin Khan, *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), French, Sindhi, Tamil etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

A Review

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265. ISBN 81-85063-14-1 (Pbk)
81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۷ — اپریل ۱۹۸۸

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

روزہ کے بارہ میں

روایات میں آتا ہے کہ رمضان کا مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں آپ نے رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کی فضیلت بتائی:

قال علی رضی اللہ عنہ فقمت فقلت یا رسول اللہ، ما افضل الاعمال فی ھذا الشھر فقال یا ابا الحسن، افضل الاعمال فی ھذا الشھر الورع من محارم اللہ

علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اے ابوالحسن، اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل ہے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا۔

اس روایت سے روزہ کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ روزہ کی اصل روح ان چیزوں سے اپنے آپ کو روکنا ہے جن سے رکنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ رمضان کے دنوں میں کھانے پینے جیسی چیزوں سے روزہ رکھنے کا حکم دراصل اسی کا عملی سبق ہے۔ کھانا پینا وہ آخری چیز ہے جس سے کسی آدمی کو روکا جائے۔ انسان کو آخری ضرورت سے روکنا اس کو شدید تر انداز میں یہ سبق دینا ہے کہ خدا نے جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان سے لازماً تمہیں رکنا ہے، خواہ یہ رکنا تمہارے ذوق اور عادت کے لیے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، خواہ اس کی فہرست تمہاری زندگی کی لازمی ضرورتوں تک کیوں نہ پہونچ جائے۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما من عبد صائم یُشتم فیقول سلام علیکم لا اشتمك کما تشتمنی اِلّا قال الرب تبارك وتعالیٰ: استجار عبدی بالصوم من شر عبدی فقد اجرتہ من النّار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بھی کسی روزہ دار کو گالی دی جائے اور وہ کہے کہ تم پر سلامتی ہو، میں تم کو گالی نہیں دوں گا جیسے تم نے مجھ کو گالی دی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے ایک شخص کی برائی سے روزہ کی پناہ لی تو میں نے بھی اس کو آگ سے پناہ دیدی۔

روزہ کا مقصد یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ آدمی کی زندگی پابند زندگی ہو نہ کہ بے قید زندگی۔

یہ اسلام نہیں

ایک مقام پر رمضان کے زمانہ میں فساد ہو گیا۔ وہاں کے ایک صاحب سے ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ کو میری ملاقات ہوئی۔ میں نے واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ رات کا وقت تھا۔ مسلمان مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں سڑک سے شور وغل سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ دوسری قوم کے لوگوں کی شادی پارٹی گزر رہی ہے اور جگہ جگہ رک کر گاتی بجاتی ہے۔ اس وقت مسجد سے نکل کر کچھ مسلمان سڑک پر آئے اور جلوس والوں سے کہا کہ آپ لوگ یہاں شور نہ کریں۔ کیوں کہ مسجد کے اندر ہماری نماز ہو رہی ہے۔ مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ اس پر تکرار ہوئی یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے فساد ہو گیا۔

میں نے کہا کہ یہ تو آپ لوگوں کا طریقہ ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں مکہ پر اور بیت اللہ پر مشرکین کا قبضہ تھا۔ وہ لوگ رسول اللہ کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔ اسی میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جب بیت اللہ میں جاتے تو وہ لوگ وہاں آکر شور وغل کرتے۔ وہ سیٹی بجاتے اور تالیاں پیٹتے اور کہتے کہ یہ ہمارا عبادت کا طریقہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے:

وما كان صلاتهم عند البيت الا مكاء و تصدية فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون (الانفال ۳۵)

اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا۔ تو اب عذاب چکھو اپنے انکار کی وجہ سے۔

اس آیت کی تشریح کے سلسلے میں چند تفسیروں کے حوالے یہ ہیں:

عن ابن عمر انه قال۔ انهم كانوا يضعون خدودهم على الارض ويصفقون ويصفرون. ويصنعون ذالك ليخلطوا بذلك على النبي صلى الله عليه وسلم صلاته۔ وقال الزهري

حضرت عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ مکہ کے مشرکین اپنے رخسار زمین پر رکھتے اور تالی بجاتے اور سیٹی بجاتے۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو گڈمڈ کر دیں۔ اور

يستهزؤن بالمومنين ۔
(تفسير ابن كثير)

زُھری نے کہا کہ وہ مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے ایسا کرتے تھے ۔

ذالك انهم كانوا يطوفون بالبيت عراة وهم مشبكون بين اصابعهم يصفرون فيها و يصفقون وكانوا يفعلون نحو ذالك اذا قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم فى صلوته يخلطون عليه (تفسير نسفى)

وہ بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے اور وہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر اس میں سیٹی بجاتے اور تالیاں بجاتے ۔ وہ ایسا اس وقت کرتے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآن پڑھتے ، وہ گڈمڈ کرنا چاہتے تھے ۔

اى ما كانت عبادة المشركين وصلاتهم عند البيت الحرام الا تصفيرا وتصفيقا ۔ وكانوا يفعلونهما اذا صلى المسلمون ليخلطوا عليهم صلاتهم ۔
(صفوة التفاسير)

یعنی بیت اللہ الحرام میں مشرکین کی عبادت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ سیٹی بجاتے اور تالیاں بجاتے ۔ اور یہ دونوں کام وہ اس وقت کرتے جب کہ مسلمان نماز پڑھتے تاکہ ان کی نماز کو گڑبڑ کر دیں ۔

عن سعيد قال : كانت قريش يعارضون النبى صلى الله عليه وسلم فى الطواف يستهزؤن به يصفرون ويصفقون ۔ وقال مقاتل كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا صلى فى المسجد قام رجلان عن يمينه فيصفران ورجلان عن يساره فيصفقان ليخلطوا على النبى صلى الله عليه وسلم صلوته ۔
(التفسير المظهرى)

حضرت سعید نے کہا کہ قریش طواف کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ، وہ سیٹی بجاتے اور تالی بجاتے ۔ اور مقاتل نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد حرام میں نماز پڑھتے تو آپ کے دائیں طرف دو آدمی کھڑے ہو جاتے اور دونوں سیٹی بجاتے اور دو آدمی آپ کے بائیں طرف کھڑے ہو جاتے اور تالیاں بجاتے تاکہ رسول اللہ پر آپ کی نماز کو گڈمڈ کر دیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۱۳ سال تک رہے ۔ وہاں مسلسل آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا رہا جس کا ذکر اوپر کے اقتباسات میں آیا ہے ۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ اس کے

خلاف کوئی احتجاج یا کوئی جوابی کارروائی کریں۔ آپ اس قسم کی تمام باتوں پر یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس زمانہ میں اہل ایمان کی ایک تعداد جمع ہوگئی تھی۔ یہ لوگ نہایت بہادر اور جاں نثار تھے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر مشرکوں پر ہجوم کریں یا ان کو شور وغل سے روکنے کے لیے کوئی جوابی عملی کارروائی کریں۔

مشرکوں کے شور وغل پر آپ کا چپ رہنا خوف کے تحت نہیں تھا بلکہ منصوبہ کے تحت تھا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ خدا کے پیغام رسانی کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے ضروری سمجھا کہ جھگڑے اور ٹکراؤ والی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مشرکین کی ان تمام باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف دعوت و تبلیغ کی محنت میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حالات میں تبدیلی فرمائی۔ اس کے بعد مشرکین کے شور کا بھی خاتمہ ہوگیا اور خود مشرکین کا بھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد کے اندر گھس کر شور وغل کیا جاتا تھا۔ تب بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ مسجد کے قریب کی سڑک پر کوئی جلوس شور کرتا ہوا گزرے تو وہ اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اسلام وہ ہے جو رسول اللہؐ نے کیا تو مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام نہیں۔ اور اگر اسلام وہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان کر رہے ہیں تو رسول اللہؐ نے جو کچھ کیا وہ اسلام نہیں تھا۔ اب مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ دونوں میں سے جس بات کو چاہیں اپنے لیے پسند کریں۔

دے کر پانا

ڈاکٹر تارا چند کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندستانی کلچر پر اسلام کے اثرات" سوا تین سو صفحہ کی یہ کتاب ایک مفید اور منصفانہ کتاب ہے اور ہر شخص کو اسے پڑھنا چاہیے۔ اس کتاب کے ایک حصہ میں فاضل مصنف نے دکھایا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان تاجر جنوبی ہند کے ساحل پر اترے تو یہاں ان کو زبردست اہمیت (Great importance) حاصل ہوگئی۔ مقامی لوگوں نے ان کو "ماپلاّ" کا خطاب دیا جس کے معنی عظیم فرزند کے ہوتے ہیں تقریبات کے موقع پر مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو اس وقت نائر لوگوں کو بھی حاصل نہ تھا (۳۵) وغیرہ وغیرہ

کالی کٹ کے راجہ زمورن نے ان عرب مسلمانوں کی غیر معمولی قدرومنزلت کی۔ حتیٰ کہ اس نے واضح طور قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ اسے اپنے ان جہازوں کے لیے کارکن مل سکیں جن پر اس کی عظمت و ترقی کا انحصار تھا۔ اس نے یہ حکم دے دیا کہ اس کی مملکت میں ماہی گیروں کے ہر گھرانے میں سے ایک یا دو مرد افراد کی تربیت مسلمان کی حیثیت سے کی جائے :

> The Zamorin thought so highly of the Muslims that he definitely encouraged conversion in order to man the Arab ships on which he depended for his aggrandizement. He gave orders that in every family of fishermen (Makkuvans) in his dominion one or more of the male members should be brought up as Muhammadans.
>
> Dr. Tara Chand, *Influence of Islam on Indian Culture*, The Indian Press Ltd., Allahabad, 1963, p. 36

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ عرب مسلمان جہازرانی میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔ اپنی اس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جب وہ ہندستان کے ساحل پر اترے تو یہاں کے ذمہ داروں کو محسوس ہوا کہ وہ ہماری بحری ضرورت ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم اپنی ترقی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ ابتدائی مسلمان اہل ہند کے لیے قیمتی سرمایہ بن گئے۔ انھوں نے دوسروں کو دیا، اس لیے دوسروں نے بھی انھیں دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف دوسروں سے مانگ رہے ہیں، اس لیے وہ ابتک پانے والے بھی نہیں بنے۔ موجودہ دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے نہ کہ مانگنے والے کو۔

چیلنج نہ کہ ظلم

ایڈمنڈ برک (Edmund Berke) کا قول ہے کہ جو شخص ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز بناتا ہے۔ ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے:

He that wrestles with us, strengthens our nerves, and shapens our skill. Our antagonist is our helper.

یہ عین وہی بات ہے جو شیخ سعدی نے گلستاں کی ایک کہانی کے تحت تمثیلی طور پر اس طرح کہی ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بلّی جب عاجز ہو جاتی ہے تو وہ اپنے چنگل سے شیر کی آنکھ نکال لیتی ہے:

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود برآرد بہ چنگال چشم پلنگ

دوسروں کی طرف سے آپ کے خلاف کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس کو ظلم سمجھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو چیلنج قرار دیں۔ ظلم سمجھنے کی صورت میں شکایت کا ذہن پیدا ہوتا ہے، اور چیلنج سمجھنے کی صورت میں مقابلہ کا۔

شکایتی ذہن کو اپنے کرنے کا کام صرف یہ نظر آتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے خلاف چیخ پکار شروع کر دے۔ وہ اس کے خلاف اپنے تمام احتجاجی الفاظ استعمال کر ڈالے۔ اس کے برعکس مقابلہ کا ذہن عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ حالات کو سمجھ کر جوابی طریقہ تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے تاکہ حکمت اور تدبیر کے ذریعہ فریق ثانی کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا دے۔

شکایت اور احتجاج کا ذہن آدمی کو ایسے راستوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ اپنی بچی ہوئی قوت بھی بے فائدہ ہنگاموں میں ضائع کر دے۔ جب کہ چیلنج اور مقابلہ کا ذہن آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے، وہ اس کو نیا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ وہ اس کو اتنا عظیم بنا دیتا ہے کہ کمزور بھی طاقت ور پر غالب آجائے، اور بلّی بھی شیر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دے۔

ہار مان کر

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان میں اتر گئیں۔ جنرل ڈگلس میک آرتھر (Douglas MacArthur) امریکہ کی طرف سے جاپان کے سپریم کمانڈر مقرر ہوئے۔ جو ۱۹۵۱ تک وہاں رہے۔ اس کے بعد جنرل میک آرتھر کی مرضی کے مطابق جاپان کا نیا دستور بنایا گیا جو ۳ نومبر ۱۹۴۶ کو جاپانی اسمبلی میں منظور کر لیا گیا۔ اس دستور کے تحت شہنشاہِ جاپان کی حیثیت گھٹا کر اس کو علامتی حکمراں (Symbol of the State) کا درجہ دے دیا گیا۔ دستور کی دفعہ ۹ کے تحت جاپانی قوم نے عہد کیا کہ وہ کبھی بھی نہ زمینی، بحری یا ہوائی فوج رکھے گی اور نہ کسی قسم کی اور کوئی جنگی تیاری کرے گی:

Land, sea, and air forces, as well as other war potential, will never be maintained (10/87).

یہ دستور بظاہر جاپان کی مستقل قومی موت کے ہم معنی تھا۔ مگر جاپان کے لیڈروں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کو مکمل طور پر منظور کر لیا۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ یہ دستور اگرچہ فوجی اور سیاسی اعتبار سے جاپان کے لیے اقدام کا راستہ بند کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے لیے سائنس اور صنعت میں اقدام کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ جاپان کی قوم جنگی اور سیاسی ٹکراؤ کے میدان سے واپس آکر علم اور صنعت کے میدان میں باقی ماندہ مواقع کو استعمال کرنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف ۴۰ سال بعد مورخ کو جاپان کے بارے میں یہ الفاظ لکھنے پڑے ——— ۱۹۴۵ کی دوسری عالمی جنگ میں شکست کھایا ہوا جاپان، دوبارہ جنگ کے کھنڈروں سے اٹھ کھڑا ہوا اور دنیا کی ایک عظیم اقتصادی طاقت بن گیا:

Defeated in World War II (1945), Japan emerged from the ruins of war as one of the major economic powers in the world (V/519).

حال کو مان لینا آدمی کے لیے مستقبل کا راستہ کھولتا ہے۔ جو لوگ حال کو نہ مانیں وہ مستقبل کے عظیم تر امکانات کو پانے سے بھی محروم رہیں گے۔

تاریخ کا سبق

سرٹامس رو (Sir Thomas Roe) سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں لندن سے ہندستان آیا اور یہاں تین سال (۱۶۱۸ - ۱۶۱۵) تک رہا۔ اس نے مغل حکمراں جہانگیر سے تعلق پیدا کیا۔ دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ ترکی زبان جانتا تھا اور جہانگیر سے براہ راست گفتگو کر سکتا تھا۔

سرٹامس رو (۱۶۴۴ - ۱۵۸۱) جب ہندستان آیا، اس وقت جہانگیر اجمیر میں تھا۔ ٹامس رو اجمیر پہنچا اور تین سال تک یہاں رہا۔ جہانگیر کبھی کبھی اس کو اپنے دربار میں بلاتا اور اس سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا۔ ٹامس رو نے اندازہ کیا کہ جہانگیر کو فن مصوری سے بہت دل چسپی ہے۔ اس نے ایک روز جہانگیر کی خدمت میں ایک تصویر پیش کی۔ جہانگیر کو یہ تصویر بہت پسند آئی۔

ٹامس رو نے محسوس کیا کہ وہ جس وقت کا منتظر تھا، وہ وقت اب اس کے لیے آگیا ہے۔ اس نے بادشاہ سے ایک ایسی چیز مانگی جو بظاہر بہت معمولی تھی۔ یہ چیز تھی، ہندستان کے ساحلی شہر سورت میں فیکٹری (تجارتی ادارہ) قائم کرنے کی اجازت۔ بادشاہ نے ایک فرمان لکھ دیا۔ جس کے مطابق انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو سورت میں اپنا تجارتی ادارہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔

ہندستان کے ایک شہر میں تجارتی ادارہ کھولنے کی اجازت بظاہر بہت معمولی چیز تھی۔ کیونکہ اس کے باوجود ہندستان کا وسیع ملک مغل حکمراں ہی کے حصہ میں تھا۔ عظمت وشان اور قوت وطاقت کے تمام مظاہر پر دوسروں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ مگر سورت میں تجارتی ادارہ قائم کرنا انگریز کو وہ سِرا دے رہا تھا جو بالآخر اس کو تمام دوسری چیزوں پر قبضہ دلا دے۔ چنانچہ انگریز نے اس کمتر چیز کو قبول کر لیا اور اس کے بعد تاریخ نے بتایا کہ جو کم تر پر راضی ہو جائے وہ آخر کار برتر پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہ تاریخ کا سبق ہے، مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس تاریخ سے سبق حاصل کریں۔

تشخیص کا مسئلہ

مسلمان موجودہ زمانہ میں احساس محرومی کا شکار ہوئے۔ وہ ایسے حالات سے دوچار ہوئے جس نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کوئی چیز ان سے کھوئی گئی ہے۔ اس موقع پر اصل سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے، کیوں کہ آدمی جس چیز کے بارے میں احساس محرومی سے دوچار ہو اسی کو وہ پانے کی کوشش کرے گا۔ اسی کے بارے میں وہ اپنا سارا زور لگا دے گا۔

اس موقع پر ایک سنگین حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے انھیں یہ احساس دلایا کہ ان سے جو چیز کھوئی گئی ہے وہ حکومت ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو شاعر اور خطیب اور انشار پرداز پیدا ہوئے، اور جو نام نہاد مفکرین ان کے درمیان اٹھے ان سب نے اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ تم حکومت سے محروم ہوگیے ہو اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے تم کو موجودہ زمانہ میں حقیر اور کمزور کر دیا ہے۔

اس تشخیص کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ تمام مسلمان نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں حکومت و اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء ملت اور تجدید اسلام کے نام سے جو کوششیں کی ہیں وہ تقریباً سب کی سب اسی ایک خانہ میں جاتی ہیں۔ مگر ان کوششوں کی صدفی صد ناکامی بتاتی ہے کہ وہ تشخیص صدفی صد غلط تھی جس کی بنیاد پر یہ تحریکیں اٹھائی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جو چیز کھوئی ہے وہ تعلق باللہ ہے۔ اللہ پر زندہ عقیدہ، اللہ کی سچی پرستش، اللہ کے آگے مسئولیت کی تڑپ، اللہ کے لیے جینے اور مرنے کا احساس، یہ ہے وہ اصل چیز جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے یہ محرومی اتنی عام ہے کہ اصاغر اور اکابر، حتیٰ کہ بے ریش اور باریش دونوں قسم کے مسلمان اس سے خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہی اصل کمی ہے جس نے ان کے اندر دوسری تمام کمیاں پیدا کی ہیں۔ جب تک ان کی یہ کمی دور نہ ہو وہ اپنی اسی موجودہ حالت میں پڑے رہیں گے۔ کسی بھی دوسری چیز کا حصول ان کے مرض کا علاج نہیں بن سکتا۔

علامتی سرزمین

شارلی مان (۸۱۴ - ۷۴۲ء) عباسی خلیفہ ہارون رشید کا ہم عصر تھا۔ مغربی یورپ کے بڑے حصہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ ہارون رشید کے زمانہ حکومت (۸۰۹ - ۷۸۶ء) میں ایسا ہوا کہ خلیفہ اور فرینک شہنشاہ شارلی مان کے درمیان بعض سفارتی تبادلے ہوئے۔ اس میں بظاہر شارلی مان کا مقصد یہ تھا کہ لاتینی اہل کلیسا کے لیے یروشلم میں کچھ مراعات حاصل کی جائیں:

It was in Harun's reign that certain diplomatic exchanges took place between the caliph and the Frankish emperor Charlemagne.

پروفیسر ہٹی نے بعض مسیحی ماخذ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خلیفہ بغداد کی طرف سے اس وقت شارلیمان کے لیے جو قیمتی تحفے بھیجے گیے، ان میں ایک پیچیدہ گھڑی (Intricate clock) بھی شامل تھی۔ (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۲۹۸)

۱۲ سو سال پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ یورپ کے بادشاہ کو وقت کا وہ اعلیٰ تحفہ بھیج سکتے تھے جو خود یورپ میں ناقابل حصول تھا۔ اور یورپ کا مسیحی بادشاہ فلسطین میں اپنے ہم مذہبوں کے حق میں معمولی مراعات حاصل کرنے کے لیے مسلم خلیفہ سے رجوع کرتا تھا، آج یہ حال ہے کہ اسی فلسطین میں مسلمانوں کی خود اپنی جان و مال بھی محفوظ نہیں۔

فلسطین کے قدیم وارثوں (یہود) کے لیے یہ قانون تھا کہ اگر وہ خدا کے دین پر قائم رہیں تو انھیں فلسطین میں باعزت زندگی حاصل ہو۔ اور اگر وہ خدا کے دین سے ہٹ جائیں تو خدا کا فر قوموں کے ذریعہ انھیں فلسطین میں ذلیل کر دے (بنی اسرائیل ۸) فلسطین اپنے قدیم وارثوں کے لیے خدا کے رحمت اور غضب دونوں کی علامت تھا۔ اسی طرح فلسطین اپنے نئے وارثوں (مسلمانوں) کے لیے بھی خدا کے رحمت اور غضب کی علامت ہے۔ مسلمان اگر خدا کے دین پر قائم ہوں تو وہ فلسطین میں عزت پائیں گے۔ اور اگر وہ خدا کے دین پر قائم نہ رہیں تو اندیشہ ہے کہ فلسطین میں ان کا وہی انجام ہو جو اس کے سابق وارثوں کا اس بابرکت زمین میں ہوا۔

بربادی کے باوجود

"ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے" یہ ایک ابدی اصول ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس اصول کے بہت سے عملی نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی میں جن مسلمانوں کے اوپر اسپین کے دروازے بند کیے گیے تھے، انھیں کے ذریعہ افریقہ کے بربری قبائل میں اسلامی دعوت کے دروازے کھلے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بربری قبائل کے لوگ اپنے پہاڑوں کے حصار میں بند تھے اور اپنی خود مختاری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلہ کو کامیابی سے روکا۔ اور اس بنا پر ان کو مسلمان بنانے میں بہت دشواریاں حائل ہوئیں۔ قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمراء) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

بربری قبائل کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے۔ جو سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیئے گیے تھے۔ اور اس کے بعد افریقہ آکر اسی خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کو سرانجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کار خیر پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو ان کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیت اور نور ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ

روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل پکیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل وکرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہونچاؤ۔ خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات انتخاب کرکے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبائل جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علم طب اور صنائع وحرفت اور تمدن کے دیگر فوائد کی بدولت بربری قبائل کے ہاں اپنا مطلوبہ اثر ورسوخ قائم کرلیا اور ہر ایک خانقاہ اسلامی تعلیم کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم وفضل کی کشش سے بہت سے طالب علم ان کے گرد و پیش جمع ہوگیے، اور کچھ عرصے کے بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کا مذہب ان قبائل کے تمام علاقوں اور صحرائے الجزائر کی بستیوں میں پھیل گیا" پریچنگ آف اسلام، صفحہ ۳۵-۱۳۴

پروفیسر آرنلڈ کا مذکورہ اقتباس بتاتا ہے کہ قدیم اسپین کی تاریخ سے دو قسم کے واقعات وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ عیسائیوں نے انھیں اسپین سے ظالمانہ طور پر نکالا۔ دوسرے یہ کہ ان نکلے ہوئے مسلمانوں نے باہر آکر اسلام کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص "پہلے اسپین" کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، "دوسرے اسپین" کو جاننے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جنھیں اندھیرے تو خوب نظر آئیں، مگر اجالے ان کو دکھائی نہ دے سکیں۔

حکمتِ دعوت

لکل اُمّۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازعنّك فی الامر وادع الی ربك انك لعلی ھدًی مستقیم وان جادلوك فقل اللہ اعلم بما تعملون۔ اللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ فیما کنتم فیہ تختلفون۔

(الحج ۶۷ - ۶۹)

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریقہ ٹھہرا دیا تو وہ اسی طرح عمل کرتے ہیں۔ پس وہ تم سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ بیشک تم سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں یہ روایت آئی ہے کہ وہ اس وقت اتری جب کہ مشرکوں (بدیل بن ورقا، بشر بن سفیان، یزید بن خنیس) نے اہلِ ایمان سے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ جس جانور کو تم نے مارا اس کو تم کھاتے ہو اور جس جانور کو خدا نے مارا اس کو تم نہیں کھاتے، یعنی مردار کو (نزلت حین قال المشرکون للمسلمین مالکم تأکلون ما قتلتم ولا تاکلون ما قتلہ اللہ یعنی المیتۃ، تفسیر النسفی، الجزء الثالث، صفحہ ۱۱۰)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب عرب میں تشریف لائے تو عرب کے لوگ معروف معنوں میں بے دین نہ تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے نام پر ایک ڈھانچہ اختیار کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات اس مذہبی ڈھانچہ سے ٹکراتی تھیں۔ (مثلاً ان کے مروجہ مذہب میں مردار جائز تھا، جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کو حرام بتاتے تھے) اس طرح کے اختلافات کی بنا پر وہ آپ سے بدکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بزرگوں کے راستہ پر چلنے والا کہتے تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے بزرگوں سے ہٹ کر نیا راستہ نکالا ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ ان ظواہر میں نہ الجھیں۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں کو لے کر بحث کرنے آئیں۔ ان سے اعراض کرتے ہوئے اصل صراطِ مستقیم (دعوت الی اللہ) پر قائم رہیں۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے مدعو کے سامنے ہمیشہ اساسی تعلیمات

رکھے، وہ ظاہری امور اور فروعی اختلافات میں اس سے نہ اُلجھے۔

آیت میں فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ کا فقرہ ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اس امر میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں۔ یہاں خطاب کا رُخ بظاہر فریق ثانی کی طرف ہے۔ مگر یہ ایک اسلوب ہے۔ ورنہ یہاں اصل مخاطب خود فریق اول ہے۔ یعنی ظاہر کلام کے اعتبار سے مدعو سے کہا جار ہا ہے کہ وہ جھگڑا نہ کریں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم ان سے جھگڑا نہ کرو۔ عربی میں اگر یہ کہا جائے کہ لَا يَضْرِبَنَّكَ زَيْدٌ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ زید کو منع کیا گیا کہ وہ تم کو نہ مارے۔ بلکہ خود مخاطب سے کہا گیا کہ تم یک طرفہ احتیاط کے ذریعہ اس کی کوشش کرو کہ زید تم کو مارنے نہ پائے:

قال الزجاج معنى قوله (لاينازعنّك) لاتنازعهم انت۔ كمايقال لايخاصمنّك فلان۔ اى لاتخاصمه۔ وهذا جائزٌ فيمايكون بين اثنين۔ وذالك لان المنازعة و المخاصمة لاتتم الّا باثنين فاذاترك احدهما ذهبت المخاصمة۔
(التفسیر المظہری، المجلد السادس، صفحہ ۳۴۶)

زجاج نے کہا کہ لَا يُنَازِعُنَّكَ کا مطلب یہ ہے کہ تم خود ان سے نزاع نہ کرو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں آدمی تم سے مخاصمت نہ کرے، یعنی تم اس سے مخاصمت کی نوبت نہ آنے دو۔ یہ اس وقت کے لیے ہے جب کہ نزاع دو آدمیوں کے درمیان ہو۔ اس لیے کہ نزاع اور جھگڑا دو آدمیوں کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پس جب دونوں میں سے ایک شخص نزاع چھوڑ دے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

اس قرآنی حکم کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص خدا کے دین کی دعوت دینا چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ دعوت کے ساتھ نزاع کو جمع نہ کرے۔

داعی اور مدعو کے درمیان اگر نزاع کی فضا ہو تو مدعو کبھی کھلے ذہن کے ساتھ داعی کی بات نہیں سنے گا۔ اس لیے داعی کو یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرکے اپنے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا کو باقی رکھے تاکہ مدعو اس کی باتوں پر ہمدردانہ غور کر سکے۔

ہر نزاع ختم ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ایک فریق اس کو بلا شرط ختم کر دے۔

تین قسم

عن بُریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القُضاۃُ ثلاثۃٌ۔ واحد فی الجنۃ واثنان فی النار۔ فاما الذی فی الجنۃ فرجلٌ عرف الحق فقضیٰ بہ ورجلٌ عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجلٌ قضی للناس علی جھل فھو فی النار۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک جنّت میں جائے گا اور دو آگ میں جائیں گے۔ پس جنت والا وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جس نے حق کو پہچانا پھر اس کے خلاف فیصلہ دیا تو وہ آگ میں جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہے جو جہالت کی بنیاد پر لوگوں کے لیے فیصلہ کرے تو وہ بھی آگ میں جانے والا ہے۔

حق کو جاننے کے لیے باطل کے پردوں کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ پھر حق کو جاننے کے بعد اس کو ماننا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا بھی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس معرفت اور اس قربانی کا ثبوت دیں وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتے ہیں کہ انھیں جنت میں داخل کیا جائے اور بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

بقیہ دو قسم کے لوگ جنت میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔ جو شخص حق کو جاننے کے بعد اس سے انحراف کرے وہ خدا کے مقابلہ میں سرکشی کرتا ہے۔ ایسے شخص کو جہنم کے سوا اور کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ اسی طرح تیسرا شخص بھی خدا کی سزا کا مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے معاملہ میں سنجیدہ ثابت نہ ہو سکا۔ کوشش کے باوجود اجتہادی خطا کرنا قابل معافی ہے مگر تیاری اور تحقیق کے بغیر شرعی امور میں فیصلے دینا قابل معافی نہیں۔

یہاں جس " فیصلہ " کا ذکر ہے، اس کا تعلق صرف عدالت سے نہیں بلکہ تمام امور سے ہے۔ ہر آدمی ہر آن فیصلے کر رہا ہے، ہر آدمی ہر آن اپنے آپ کو یا جنت کا مستحق بنا رہا ہے یا دوزخ کا۔

موقع شناسی

غزوۂ احد شوال ۳ ھ میں پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمان غالب رہے۔ مگر بعد کو انھیں شکست ہوئی۔ تقریباً ستر اصحاب شہید ہوئے۔ جب مسلمان منتشر ہوگیے تو دشمنوں کا ہجوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا۔ انھوں نے آپ کے اوپر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ عبد اللہ بن قمئہ اور عتبہ بن ابی وقاص وغیرہ نے آپ پر اس زور کے ساتھ پتھر مارے کہ آپ کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ سامنے کا دانت ٹوٹ گیا۔ لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں اندر تک گھس گئیں۔ بعد کو ابو عبیدہ بن الجراح نے ان کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ان کے دو دانت ٹوٹ گیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک پہلو پر گر پڑے۔ اس وقت آپ نے پہاڑ کے ایک گڑھے میں پناہ لی تاکہ آپ دشمنوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا تو مشہور ہوگیا کہ آپ شہید ہوگیے۔ اس خبر سے آپ کے اصحاب میں زبردست سراسیمگی پھیل گئی۔ اس ہنگامی حالت میں جو مختلف واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ تھا :

قال ابن اسحاق : وكان اول من عرف رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد الهزيمة وقول الناس قُتِلَ رسول الله صلى الله عليه وسلم — كما ذكر ابن شهاب الزهري — كعب بن مالك، قال : عَرَفْتُ عينيه الشريفتين تزهران من تحت المِغْفَر، فناديتُ باعلى صوتي يا معشر المسلمين ابشروا، هذا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فاشار الىّ رسول الله صلى الله عليه وسلّم " انْ اَنْصِتْ " سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۱

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ اور پہلا شخص جس نے شکست کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور لوگوں کے اس قول کے بعد کہ آپ قتل کر دیے گیے، جیسا کہ ابن شہاب زہری نے بیان کیا، وہ کعب بن مالک ؓ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی دونوں آنکھوں کو خود کے اندر سے چمکتے ہوئے دیکھا اس وقت میں نے بلند آواز سے پکارا، اے مسلمانو، تمہارے لیے خوش خبری ہو۔ یہ ہیں اللہ کے رسول۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ چپ رہو۔

صحابی نے اس وقت جو جملہ کہا تھا اس کو الگ کر کے دیکھیے۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ

"مسلمانو، تمہیں خوش خبری ہو، اللہ کے رسول یہاں موجود ہیں" بظاہر یہ ایک صحیح اور معصوم جملہ ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا جملہ ہے جس پر کہنے والے کو ثواب ملنا چاہیے اور اس کی تعریف میں اَحْسَنْتَ اور صَدَقْتَ کا غلغلہ بلند ہونا چاہیے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چپ رہنے کے لیے کہا۔ اور وہ بھی زبان سے نہیں کہا بلکہ اشارہ سے کہا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ نے اس وقت نہ خود بولنا پسند فرمایا اور نہ یہ چاہا کہ کوئی دوسرا شخص اس موقع پر بولے۔

مذکورہ موقع پر کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آپ دشمنوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ چوں کہ اس وقت آپ شدید زخمی تھے، اس لیے آپ کا لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا ہی قرین مصلحت تھا۔ اگر وہ لوگ جان لیتے کہ آپ یہاں گڑھے میں ہیں تو وہ ہجوم کرکے وہاں آتے اور آپ کے اوپر مزید پتھر برسانا شروع کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر چپ رہنا زیادہ بہتر تھا نہ کہ بولنا۔

اسی کا نام موقع شناسی ہے۔ عملی کارروائی ہمیشہ حالات اور مواقع کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ جس کارروائی میں حالات اور مواقع کی رعایت شامل نہ ہو وہ خودکشی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی عملی کارروائی۔

حالات کبھی یکساں نہیں رہتے، ان میں بار بار تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے طریق عمل میں بھی بار بار تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کبھی ایک مقصد کو اعلان کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے کبھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اخفار کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کبھی آدمی مجبور ہوتا ہے کہ فریق ثانی کے ساتھ مقابلہ کرے، کبھی زیادہ کامیاب تدبیر یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مقابلہ کے میدان سے ہٹا دے۔ کبھی پانے کی کوشش کا نام پانا ہوتا ہے اور کبھی پانا اس کا نام ہوتا ہے کہ کھونے کو برداشت کر لیا جائے۔

موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ حکمت اتنی زیادہ ضروری ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو بھی اس کی رعایت کرنی پڑی، پھر دوسرے لوگ اس کی رعایت کیے بغیر کیسے کوئی حقیقی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

راہِ عمل

قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں جو حدیثیں آئی ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے :

عن عُمَر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ، إنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهٰذا الكِتَابِ أقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِيْن (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اٹھاتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کو گرا دیتا ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کسی گروہ کے پاس قرآن کی محض موجودگی وہ چیز ہے جو اس کو ترقی اور کامیابی کے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ زمانہ کے مسلمان ہرگز تباہی اور بربادی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ آج مسلمانوں کے پاس ہر جگہ قرآن موجود ہے۔ آج پریس کا دور ہے۔ قرآن کے نہایت صحیح نسخے کروروں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیل گیے ہیں۔ کوئی گھر اور کوئی مسلم بستی ایسی نہیں ہے جہاں قرآن کے نسخے لوگوں کے پاس موجود نہ ہوں۔

پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے۔ کیوں کر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ کوئی قوم اوپر اٹھتی ہے، اور دوسری قوم قرآن کے ذریعہ سے گر کر تباہ ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ نتیجہ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کریں وہ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں، اور جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار نہ کریں وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن میں زندگی کی تمام حقیقتیں بتا دی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ (الانبیاء ۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری جس میں تمہارا ذکر ہے۔

اس آیت میں " ذکر " سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں ہم دو حوالے نقل کرتے ہیں :

(فیہ ذکرکم) ای ذکر ما تحتاجون الیہ

یعنی ان تمام باتوں کا تذکرہ جو دین کے معاملہ

من امر دینکم (التفسیر المظہری) فیہ ذکر دینکم میں تمہیں درکار ہیں۔ قرآن میں تمہارے دین کا بھی
ودنیاکم (تفسیر النسفی) ذکر ہے اور تمہاری دنیا کا بھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ فتنے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اے جبریل، پھر اس کا حل کیا ہے۔ حضرت جبریل نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ اس میں آپ سے پہلے کی خبر ہے اور اس میں آپ کے بعد کی خبر ہے اور اس میں فیصلہ موجود ہے (نزل جبریل علیہ السلام علی عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ انہا ستکون فتن۔ قال فما المخرج منہا یا جبریل۔ قال کتاب اللہ۔ فیہ نبأ ما قبلکم و نبأ ما ھو کائن بعدکم وفیہ الحکم بینکم، جامع الاصول، جزء ۸، صفحہ ۴۶۴)

جب قرآن کی حیثیت یہ ہے تو ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے مسائل کے لیے قرآن کو دیکھیں اور اسی کے اندر اس کا حل تلاش کریں۔ قرآن کے اندر جب تمام باتیں ہیں تو یقیناً اس کے اندر ہمارے موجودہ سنگین مسائل کا بیان بھی ہونا چاہیے، اور یہ بھی کہ ان مسائل کا واقعی حل کیا ہے۔ ہمیں قرآن میں دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمارے مسائل کے بارہ میں ہمیں کیا نقطۂ نظر دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں تمام مسائل کے بارہ میں اعلیٰ رہنمائی موجود ہے۔ مگر اس رہنمائی کو پانے کے لیے صرف قرآن کو پڑھ لینا کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو اس کامل آمادگی کے ساتھ پڑھا جائے کہ جو رہنمائی قرآن میں ملے گی اس کو میں بے چون وچرا قبول کرلوں گا۔

قرآن کی رہنمائی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر قرآن سے رہنمائی حاصل کریں۔ جو قرآن کی رہنمائی کو ماننے کے لیے اس طرح تیار ہوں کہ قرآن اگر ان کی سوچ کی تصدیق نہ کرے تو وہ پکار اٹھیں کہ "میں غلطی پر تھا" مفاد یا ذاتی وقار کا سوال جن کے لیے سچائی کو مان لینے میں رکاوٹ نہ بنے۔

سچائی کو پانے کے لیے اپنے آپ کو جھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اپنے جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ نہ کرے وہ اس دنیا میں سچائی کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔

تخلیق کا مقصد

یہ دنیا جس میں ہم ہیں، اس کو اگر بامقصد دنیا سمجھا جائے تو اِس سے آدمی کے اندر یہ احساس ابھرے گا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق بنائے۔ اسی کا نام ذمہ دارانہ زندگی ہے۔ اور ذمہ دارانہ زندگی کا احساس ہی تمام انسانی خوبیوں کا اصل محرک ہے۔

اس کے برعکس اگر موجودہ دنیا کو بے مقصد دنیا فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد یہ احساس بھی مٹ جاتا ہے کہ ہم سے اوپر کوئی مقصد ہے، اور ہم کو اسی مقصد سے مطابقت کر کے اس دنیا میں رہنا ہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر بے قید آزادی کا ذہن وجود میں آتا ہے، اور بے قید آزادی کا مزاج بلاشبہ تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے کون سی بات ہے جو انسانی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اور جو کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ اس حیثیت سے جب غور کیا جائے تو بلا تاخیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک بامقصد منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ بے مقصدیت کا نظریہ کائنات کے مجموعی نظام میں درست نہیں بیٹھتا، اس لیے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

انسانی فطرت چاہتی ہے کہ اچھے عمل کا اچھا انجام ہو اور برے عمل کا برا انجام۔ اگر کائنات کو بامقصد نہ مانا جائے تو انسانی فطرت یہاں بالکل بے جواب ہو کر رہ جائے گی۔ کائنات کو بے مقصد قرار دینا گویا انسان کو ایک ایسی دنیا رہنے کے لیے دینا ہے جو اس کے گہرے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اسی طرح کائنات کا وسیع تر نظام حد درجہ بامعنی انداز میں قائم ہے۔ انسان سورج کو خدا کہتا ہے مگر سورج ڈوب کر اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ انسان تکبّر کرتا ہے مگر اس پر موت آکر اس کے اس قسم کے تمام دعووں کو باطل کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کسی بے مقصد توجیہہ کو قبول نہیں کرتی۔ اس دنیا میں وہی نظریہ صحیح نظریہ ہے جو انسان کو مقصدیت کا احساس عطا کرے۔

ایک مثال

موجودہ زمانہ میں جو مسلم مصلحین اٹھے وہ زیادہ تر حالات کے رد عمل میں اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ رأفت اور ہمدردی بہت کم پائی جاتی ہے جو پیغمبر کے کلام میں کامل طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال مشہور مسلم مصنف کی اس کتاب میں نظر آئی جو انھوں نے پردہ (حجاب) کے موضوع پر لکھی ہے۔ پردہ کی اہمیت پر کلام کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"میں کہتا ہوں کہ ہندستان کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں، اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں۔ کیوں کہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دارومدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھئے، غور کیجئے۔ اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں، مگر اس بچے کھچے ستون کو، جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں، وہیں اُن آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں"

یہ واضح طور پر رد عمل کی نفسیات کے تحت نکلا ہوا کلام ہے۔ کیوں کہ کسی بگڑی ہوئی معاشرت کو صالح معاشرت بنانے کا کام یقینی طور پر حکمت اور تدریج کے ساتھ کرنا ہوگا نہ یہ کہ ہم مصلحین کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ جہاں ایک مرد کی آنکھ کسی عورت پر اٹھے، تم فوراً اس کی دونوں آنکھیں نکال کر اس کو ہمیشہ کے لیے اندھا کر دو۔

جو داعی مثبت نفسیات کے تحت اٹھے، اس کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کا نمونہ ہے۔ یہاں میں ایک مماثل واقعہ کا حوالہ دیتا ہوں۔ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں جو واقعات حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ حسب ذیل الفاظ میں منقول ہوا ہے:

عن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اردف الفضل بن العباس یوم النحر خلفہ وکان رجلاً حسن الشعر ابیض وسیماً فجاءته امراۃ من خثعم تستفتیہ فجعل الفضل ینظر الیھا وتنظر الیہ فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصرف وجہ الفضل الی الشق الآخر۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کے موقع پر فضل بن عباس کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھالیا تھا۔ وہ خوبصورت بالوں والے اور پرکشش شخصیت والے آدمی تھے۔ اس دوران قبیلہ خثعم کی ایک عورت آپ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئی۔ فضل بن عباس اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت فضل بن عباس کی طرف دیکھنے لگی۔ پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فضل بن عباس کا چہرہ دوسری طرف پھیرنے لگے۔

اوپر موجودہ زمانہ کے ایک مسلمان مصنف کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے وہ ردعمل کی نفسیات سے نکلے ہوئے کلام کی مثال ہے اور پیغمبر اسلام کا مذکورہ واقعہ مثبت نفسیات کے تحت ظاہر ہونے والے رویہ کی مثال۔

اسلام کی خدمت کے لیے اٹھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اسلام کی ابدی تعلیمات سے متاثر ہو کر اٹھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل سے متاثر ہو کر اٹھے جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو سیاسی اور تہذیبی شکست کے نتیجہ میں پیش آئے۔ اول الذکر آدمی کے اندر ایجابی نفسیات ہوگی، اور ثانی الذکر آدمی کے اندر سلبی نفسیات۔ پہلا آدمی اس جذبہ سے سرشار ہوگا کہ خدا کی جس آفاقی رحمت سے وہ آشنا ہوا ہے، اس میں دوسروں کو حصہ دار بنائے۔ اس کے برعکس دوسرا آدمی اس جذبہ میں کھول رہا ہوگا کہ جن لوگوں نے اس کو نقصان اور شکست سے دوچار کیا ہے، ان پر اپنی ساری طاقت کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مصلحینِ ملت دوسری قسم سے تعلق رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کو "اندھا" بنانے کی مثالیں قائم کیں۔ وہ لوگوں کو "بینا" بنانے کی مثال قائم نہ کر سکے۔

ملّت کا المیہ

ایک لڑکا باہر سے اپنے گھر میں آتا ہے اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ فلاں لڑکے نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ فوراً غصہ ہو جاتا ہے اور باہر نکل کر اس لڑکے سے جھگڑنے لگتا ہے جس کے خلاف اس کے بیٹے نے شکایت کی تھی۔ اس کے برعکس ایک اور باپ ہے۔ اس کا لڑکا باہر سے منہ بنائے ہوئے آیا اور محلہ کے لڑکے کے بارے میں شکایت کی کہ اس نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ نے دوسرے لڑکے کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ اس نے صرف اپنے بیٹے کو سرزنش کی کہ تم ایسے لڑکوں کے پاس کیوں گیے۔ کیا تمہارے پاس کرنے کا کوئی اور کام نہ تھا۔

وہ باپ یقیناً جھوٹا باپ ہے جو ہر معاملہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے باپ کے لڑکوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ کوئی ہنر سیکھتے اور نہ تعلیم حاصل کر پاتے۔ آخر کار وہ داداگیری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تاکہ اپنی نالائقی کو دوسروں کے اوپر انڈیل سکیں۔ اس کے برعکس دوسرا باپ سچا باپ ہے۔ اس کے لڑکے خود تعمیری کی راہ پر لگتے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر ترقی کرکے اپنا مستقبل بھی بناتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنی قوم کا مستقبل بھی۔

ہندستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے تمام لیڈر، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، سب کے سب اپنی قوم کے حق میں صرف "جھوٹے باپ" ثابت ہوئے ہیں۔ یہ لیڈر نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ ــــــ مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر بے قصور بتا کر ایڈمنسٹریشن کو یک طرفہ طور پر قصوروار ٹھہرانا ہمارے تمام لیڈر بلا استثنار مسلمانوں کے معاملہ میں مسلسل یہی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ روش کسی قوم کے لیے ہلاکت سے کم نہیں۔ اس کا نقصان تمام فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے مجموعی نقصان سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ ہے۔ قوم کے قاتل کا لقب اگر صحیح طور پر کسی کے اوپر چسپاں ہوتا ہے تو وہ بلاشبہ یہی مسلم لیڈر ہیں جو قوم کی خیر خواہی کے نام پر قوم کے سب سے بڑے بدخواہ بنے ہوئے ہیں۔

اس قسم کی قومی وکالت قوم کے حق میں حوصلہ کشی کے ہم معنی ہے۔ اس روش کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں سے عمل کا جذبہ چھین لیا ہے۔ اس دنیا میں ہر گروہ ہر حال میں مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ گروہ اگر مسائل کی ذمہ داری خود قبول کرے تو اس کے اندر عمل کا جذبہ ابھرے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے مسائل کی ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دے تو قدرتی طور پر اس کے اندر عمل کا محرک ختم ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی گروہ کے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو بتانا اس گروہ کو بے عملی کا سبق دینا ہے، اور ہمارے تمام لیڈر مسلسل یہی مجرمانہ فعل انجام دے رہے ہیں۔ ہر معاملہ میں ایڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کو ملزم ٹھہرانا بظاہر بہت خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ مگر قوم کو اس کی یہ مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے کہ اس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے افراد کے اندر یہ مزاج بن جاتا ہے کہ ہم جن کمیوں اور خرابیوں سے دوچار ہیں، اس کے ذمہ دار ہم خود نہیں ہیں بلکہ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو ہمیں ان کمیوں اور خرابیوں میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ نفسیات جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے وہ "اپنی تعمیر آپ" کی تڑپ سے خالی ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ اپنی تعمیر آپ کی تڑپ سے خالی ہو جائیں ان کے لیے مقابلہ کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

مسلم قیادت کی اس مجرمانہ روش کی ایک مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں مسلسل یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ وہاں جو شخص بھی وائس چانسلر ہو کر جاتا ہے۔ شروع میں اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جلد ہی وہ معتوب ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف یونیورسٹی کے مسلم طلبہ ایجی ٹیشن چلاتے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن میں مسلم صحافت اور مسلم قیادت بلا استثناء ان کا ساتھ دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وائس چانسلر کو بدنامی کا داغ لے کر یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وائس چانسلر جب علی گڑھ پہونچ کر قریب سے حالات کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اس "قومی ادارہ" میں بہت سی اندرونی خرابیاں ہیں جو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہاں ایسے "نونہالانِ ملت" گھسے ہوئے ہیں

جن کو پڑھنے سے زیادہ داداگیری سے دل چسپی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

وائس چانسلر اس قسم کے عناصر کے خلاف ضروری کارروائی کرتا ہے تاکہ یونیورسٹی کے فاسد عضو کا آپریشن کرکے اس کے بقیہ جسم کو صحت مند بنا سکے۔ اب جن افراد پر اس اصلاحی عمل کی زد پڑتی ہے، وہ "اسلام خطرہ میں" اور "یونیورسٹی کا اقلیتی کردار خطرہ میں" جیسے جذباتی نعرے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مسئلہ کو ایک ملی مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ وہ ہنگامہ بازی کا طریقہ اختیار کرکے یونیورسٹی کی تعلیمی فضا کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

جب ایسا ہوتا ہے تو ہر بار تمام مسلم قائدین، خواہ وہ بے ریش قیادت سے تعلق رکھتے ہوں یا باریش قیادت سے، دوبارہ اسی سبق کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں جس کو وہ دوسرے مسلم معاملات میں دہراتے رہے ہیں۔ وہ وائس چانسلر کو "ایڈمنسٹریشن" کا نمائندہ فرض کر لیتے ہیں اور طلبہ کو "مسلم ملت" کا نمائندہ۔ اور پھر بلا تحقیق مسلم طلبہ کو معصوم قرار دے کر یک طرفہ طور پر وائس چانسلر کو ملزم ٹھہرانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے الفاظ کے تمام کارتوس اس کے اوپر خالی کر دیتے ہیں۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان خود یونیورسٹی کو پہنچا ہے۔ اس نے مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کو مسلسل طور پر پست کر دیا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اب خود اچھے مسلم خاندانوں کے طلبہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی "سکنڈ چوائس" بن چکی ہے۔ یعنی اب وہ مسلم یونیورسٹی میں صرف اس وقت داخلہ لیتے ہیں جب کہ انھیں کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملا ہو۔ حتی کہ وہ مسلم لیڈر جو اخباری بیان میں مسلم یونیورسٹی کے چیمپین بنے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ بھی اپنے بیٹے بیٹیوں کی تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی کے بجائے دوسری یونیورسٹیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

یہ طریقہ جو ہمارے لیڈروں نے اسلام کے نام پر اختیار کر رکھا ہے، وہ اسلام تو کیا ہوگا وہ غیر اسلام بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اسلام خوف خداوندی کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور غیر اسلام حقیقت پسندی کی زمین پر۔ اور مذکورہ بالا روش کا تعلق نہ خوف خدا سے ہے اور نہ حقیقت پسندی سے۔

ہندستان کے دستور نے مذہبی اقلیتوں کو یہ خصوصی حق دیا ہے کہ وہ حکومت کی اعانت پر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ اس رعایت کا اطلاق جن مذہبی اقلیتوں پر ہوتا ہے، ان میں سے دو اقلیتیں خاص ہیں۔ ایک مسلمان، دوسرے عیسائی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن کو حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ طور پر مالی امداد دی جاتی ہے۔

مگر دونوں اقلیتوں میں انتہائی نمایاں فرق ہے۔ مسلمانوں نے "اقلیتی ادارہ" کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس میں مسلم اقلیت کو خصوصی رعایت دی جائے۔ مثلاً مسلمان لڑکے کم نمبر لائیں، حتی کہ فیل ہو جائیں تب بھی انھیں جگہ دی جائے۔ کسی مسلمان طالب علم کو داخلہ سے محروم نہ کیا جائے۔ عیسائی حضرات نے اپنے اقلیتی اداروں میں اس کے بالکل برعکس اصول کی پیروی کی۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ اپنے ادارہ کو اعلیٰ ترین تعلیمی معیار پر ترقی دیں۔ مسلمانوں نے اقلیتی ادارہ کا مطلب اقلیتی رعایت کا ادارہ سمجھا تھا۔ مگر عیسائی حضرات نے اقلیتی ادارہ کو اقلیتی آئیڈیل کا ادارہ بنانے پر ساری توجہ لگا دی۔ انھوں نے داخلہ کے معاملہ میں حد درجہ سختی اور اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی تعلیمی ادارے ملک کے سب سے زیادہ اچھے ادارے سمجھے جانے لگے۔ ان کے معیار کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ "کرسچین اسکول" ہے۔

ایک طرف مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ہیں جو کمتر معیار کے لیے نمونہ بن گیے ہیں۔ دوسری طرف عیسائی حضرات کے تعلیمی ادارے ہیں جو سارے ملک میں برتر معیار کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حتی کہ اب خود صاحب حیثیت مسلمان بڑی بڑی فیس ادا کر کے اپنے بچوں کو عیسائی تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں اور ان کو وہاں کا طالب علم بنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ مزاج میرے نزدیک علمی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر آج کی دنیا میں باعزت زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے اداروں کو رعایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر چلانا ہوگا۔ اور اس پر حد درجہ سختی کے ساتھ عمل کرنا ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ادارے اعلیٰ معیار کا نمونہ بنیں۔ حتی کہ سارے ملک میں وہ طالبانِ علم کے لیے "فرسٹ چوائس" بن جائیں۔ نہ کہ "سکنڈ چوائس" یا "تھرڈ چوائس" جیسا کہ آج وہ عملاً بنے ہوئے ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ علی گڑھ کے وائس چانسلر کو سفیر یا گورنر وغیرہ بنا دیا گیا۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آتا ہے، اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ نئی دہلی کو زیادہ سے زیادہ خوش کرے تاکہ آئندہ کے لیے اس کی اعزازی سیٹ محفوظ ہو جائے۔ علیگڈھ کے وائس چانسلر کے لیے نئی دہلی کو خوش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ بڑھانے کے نام پر داخلوں میں میرٹ کا اصول جاری کر دے۔ چوں کہ ہندو طلبہ تعلیم میں آگے ہیں اس لیے اس اصول کو جاری کرنے کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام اہم شعبوں (سائنس، انجینیرنگ، طب) پر ہندو طلبہ قابض ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں ہر سال مسلمانوں کا تناسب گھٹتا جا رہا ہے۔ اسی بنا پر علی گڑھ میں مسلمانوں کو رعایتی داخلے ملنے چاہئیں۔

ان حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ پاکستان (سندھ) میں بھی ہندو طلبہ وہاں کے سائنس اور انجینیرنگ اور طب کے شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ پھر پاکستان میں کس وائس چانسلر کی "غداری" کی بنا پر ایسا ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک اس قسم کا مطالبہ زندگی کا مطالبہ نہیں بلکہ موت کا مطالبہ ہے۔ یہ حقیقتِ واقعہ سے لڑنا ہے۔ اور حقیقتِ واقعہ سے لڑنے والا صرف اپنا سر توڑتا ہے۔ وہ حقیقتِ واقعہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ مسلمانوں کے مطالبہ اور احتجاج کے باوجود یونیورسٹی میں یہ عمل جاری رہے گا، جیسا کہ وہ اب تک جاری رہا ہے۔ خواہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر خود احتجاجی مہم کے کسی لیڈر کو کیوں نہ بنا دیا جائے۔ یہ ایک ناقابل عمل مطالبہ ہے۔ اور ناقابلِ عمل مطالبہ اس دنیا میں کبھی واقعہ نہیں بنتا۔

یہ مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کو زندگی کا مقام صرف استحقاق ثابت کرنے پر ملتا ہے۔ اس دنیا میں صرف وہ شخص کامیاب ہوتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ رعایت کی بنیاد پر حق نہ ملے تو وہ امتیاز کی بنیاد پر اپنا حق وصول کرے۔ دنیا اگر اس کو برابری (Equal) کی سطح پر قبول نہ کر رہی ہو تو وہ برابری سے زیادہ (More than equal) کی سطح پر اپنی حیثیت کو منوائے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حقیقت کو بدلنے کے بجائے خود اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں۔ علی گڑھ میں اگر مسلمان طلبہ کم ہو رہے ہیں تو انھیں اپنی محنت کو بڑھا کر اس کی پر تلافی پانا چاہیے۔ احتجاج اور مطالبہ کے ذریعہ یہ مسئلہ کبھی حل ہونے والا نہیں۔

ایک واقعہ

ایک لیڈر صاحب سے میری گفت گو ہوئی۔ ان کے دو لڑکے ایک "غیر مسلم" تعلیمی ادارہ میں اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکوں کو مسلم یونیورسٹی میں کیوں نہیں داخل کیا، ان کو آپ غیر مسلم ادارہ میں کیوں تعلیم دلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہاں مقابلہ (Competition) کا ماحول ہے، جب کہ مسلم یونیورسٹی میں مقابلہ کا ماحول نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کا ماحول بے حد ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آپ جو بیانات دیتے رہے ہیں اس میں آپ نے مسلسل اس نظریہ کی وکالت کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں داخلوں کے لیے رعایت (Relaxation) ہونا چاہیے۔ پھر جب بڑی ترقیاں مقابلہ کے ذریعہ ہوتی ہیں تو آپ مسلم یونیورسٹی میں اس کے خلاف ماحول کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عام مسلم طلبہ کے ساتھ اگر مسلم یونیورسٹی میں رعایت نہ کی جائے تو دوسری کون سی جگہ ہے جہاں وہ اپنے لیے رعایت پاسکیں گے۔ پھر ان کا انجام کیا ہوگا۔

میں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ایسے ماحول میں ڈالیں جہاں محنت کا محرک موجود ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے زیادہ سے زیادہ آگے بڑھیں۔ مگر قوم کے بچوں کے لیے محنت کا محرک ختم کرکے انھیں کاہل بنا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیمی طور پر پیچھے ہو جائیں۔ اپنے بچوں کو آپ تعلیمی ہیرو دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے بچوں کو تعلیمی ہریجن۔

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں کا حال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کچھ پسند کرتے ہیں اور ملت کی اولاد کے لیے کچھ۔ یہی وجہ ہے کہ لیڈر اور ان کے متعلقین کامیابی کی راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر ملت کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اور نہ آیا کہ وہ جلسوں کی بھیڑ کے ذریعہ لیڈروں کی شانِ قیادت میں اضافہ کریں اور اس کے بعد بربادی کا نشان بن کر رہ جائیں۔

خلاصۂ کلام

سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ ایک باہر رُخی (Outward oriented) سیاست۔ اور دوسرے اندر رُخی (Inward oriented) سیاست۔ باہر رخی سیاست وہ ہے جس میں کسی بیرونی طاقت کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف دھوم مچائی جائے۔ اس کے مقابلہ میں اندر رخی سیاست وہ ہے جس میں اندرونی کمیوں کو نشانہ بنا کر ان کی اصلاح پر ساری طاقت صرف کی جائے۔ پہلے قسم کی سیاست احتجاجِ غیر کا ذہن پیدا کرتی ہے اور دوسرے قسم کی سیاست تعمیرِ خویش کا۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کے درمیان نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے باہر رخی سیاست کا ہنگامہ جاری ہے۔ یہ بلاشبہ جھوٹی سیاست ہے۔ اس قسم کی سیاست کچھ سطحی لیڈروں کے لیے ذاتی طور پر مفید ہو سکتی ہے، مگر وسیع تر ملت کے لیے وہ یقینی طور پر زہر ہے۔ موجودہ مقابلہ کی دنیا میں ترقی کا واحد راز ذاتی جدوجہد ہے، اور یہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے لیڈروں کی موجودہ قسم کی سیاست نے مسلمانوں کو محروم کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ دنیا جدوجہد کی دنیا ہے۔ یہاں رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنا ہے۔ یہاں مخالفتوں کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنا ہے۔ جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں، وہی اس دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ اور جو لوگ اس امتحان میں پورے نہ اتریں، ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔
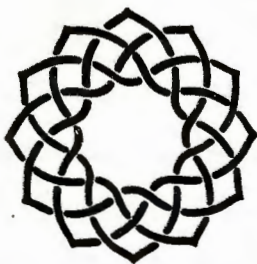
آسان حل

ایک قائد فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں جو فسادات کے خلاف تحریک چلا رہا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے ذاتی طور پر کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ میرے لیے دولت مند عرب ملکوں میں قیمتی پیش کشیں موجود ہیں اور میں وہاں جاکر آرام اور عافیت کی زندگی گزار سکتا ہوں۔

یہ آدھی سچائی ہے۔ کسی مسلمان کے لیے عرب ملکوں میں قیمتی جگہ صرف اس شرط پر ہے کہ وہ وہاں کے نظام سے مکمل موافقت کرے۔ اگر وہ وہاں جاکر اس قسم کی مخالفِ نظام تقریر کرنے لگے جیسی تقریریں ہمارے قائدین یہاں کرتے رہتے ہیں تو عرب ملکوں میں اس کی کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ اس کو فوراً وہاں سے "ڈی پورٹ" کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اصاغر اور اکابر کی بہت بڑی تعداد عرب ملکوں سے قیمتی فوائد حاصل کر رہی ہے۔ کچھ لوگ وہاں مستقل طور پر آباد ہیں۔ کچھ لوگ تقریبات اور کانفرنسوں میں شریک ہو کر اپنی شہرت اور اعزاز میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر ان فوائد کا حصول صرف اس قیمت پر ممکن ہوا ہے کہ ہر ایک وہاں کے سیاسی نظام کے بارہ میں مکمل طور پر خاموش رہتا ہے۔ وہ وہاں کی ان خرابیوں کے خلاف کبھی نہیں بولتا جن کے خلاف بولنا حکومتی نظام سے ٹکرانے کے ہم معنی ہو۔ حتی کہ اگر وہاں لاؤڈ اسپیکر کے عمومی استعمال پر پابندی ہو تو وہ یہ مطالبہ لے کر نہیں کھڑے ہوتے کہ ہم کو لاؤڈ اسپیکر کے عام استعمال کی اجازت دی جائے۔ یہی وہ واحد قیمت ہے جس کی ادائیگی نے انھیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ عرب ملکوں کے قیمتی فوائد اپنے لیے سمیٹ سکیں۔

ایسی حالت میں کہنے والوں کو یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح عرب ملکوں میں جاکر ہم لوگ وہاں کے نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں اسی طرح ہم کو یہاں بھی نظام سے موافقت کر کے رہنا چاہیے۔ اس کے بعد ہم کو یہاں بھی اسی طرح آرام اور عافیت کی زندگی مل جائے گی جس طرح ہم کو عرب ملکوں میں آرام اور عافیت کی زندگی ملی ہوئی ہے۔ یہ صرف قیمت کی ادائیگی کا مسئلہ ہے نہ کہ ایک ملک اور دوسرے ملک میں فرق کا۔

ایک سفر

قرآن ہندی سوسائٹی آف انڈیا کی دعوت پر بھوپال کا سفر ہوا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۷ کی شام کو دہلی سے بھوپال پہنچا، اور ۲۹ نومبر کی شام کو وہاں سے واپسی ہوئی۔

۲۸ نومبر کو جب میں انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۱۹ میں داخل ہوا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سیاست میں آنے سے پہلے انڈین ایر لائنز کے ایک پائلٹ تھے۔ وہ عام طور پر دہلی اور بھوپال کے درمیان جہاز چلاتے تھے۔ ان کو ابھی اس قابل نہیں سمجھا گیا تھا کہ انڈین ایر لائنز کی زیادہ لمبی پرواز ان کے حوالے کی جائے یا وہ ایر انڈیا کی انٹرنیشنل پروازوں کی کمانڈ کریں۔ مگر جمہوری سیاست کے قانون نے پورے ملک کا "جہاز" ان کے ہاتھ میں دے دیا ——— جمہوری نظام کا یہ معاملہ بھی کیسا عجیب ہے۔

جہاز میں ایک صاحب داخل ہوئے۔ ان کو رخصت کرنے کے لیے پولیس کے کئی آدمی آئے ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے سرکاری افسر ہیں۔ اتفاق سے ان کی سیٹ میرے پاس تھی۔ وہ میری نشست سے ملی ہوئی نشست پر بیٹھ گیے۔ جلد ہی بعد انھوں نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک موٹی کتاب نکال کر پڑھنے لگے۔ میں نے ایک نظر ڈالی تو کتاب کا نام یہ تھا:

The Secret Wars of the CIA

(سی آئی اے کی خفیہ جنگیں) میں نے سوچا کہ لوگ سی آئی اے کے خفیہ عمل کو جاننے کے شائق ہوتے ہیں مگر فرشتوں کے خفیہ عمل کو جاننے کا کسی کو شوق نہیں۔ سی آئی اے کے خفیہ عمل کو جاننا آدمی کو صرف ایک تفریحی معلومات دیتا ہے۔ لیکن اگر آدمی اس عمل کو جان لے جو فرشتے خفیہ طور پر ہر ایک کے چاروں طرف کر رہے ہیں تو وہ تڑپ اٹھے اور اس کی ساری زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بھوپال کی فضا میں پہنچا اور نیچے اترنا شروع ہوا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا تو چاروں طرف بجلی کے قمقمے بے شمار

تعداد میں جگ مگ کر رہے تھے۔ بالکل وہی منظر تھا جو رات کے وقت کھلے آسمان میں ستاروں کی جگمگاہٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا معلوم ہوا گویا ہمارا جہاز تاروں بھرے آسمان میں اتر رہا ہو۔

ایک لمحہ کے لیے یہ واقعہ میرے لیے زندگی کے وسیع تر سفر کی تمثیل بن گیا۔ ہم میں سے ہر شخص دنیا سے آخرت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ ہر ایک کا "جہاز" تیزی سے رواں ہے تاکہ وہ بالآخر "آسمان" میں اتر جائے۔ مگر لوگ صرف پہلے سفر کو جانتے ہیں۔ دوسرے سفر کو جاننے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

ایر انڈیا کے انفلائٹ میگزین نمسکار (جون ۱۹۸۷) میں ایک مضمون حسب ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:

Bhopal: Old and New

سات صفحہ کے اس مضمون میں مسلم بھوپال کے بارہ میں دلچسپ معلومات ہیں۔ اس کا صفحہ ۴۵ سب سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس صفحہ پر شہر بھوپال کا ایریل فوٹو دیا گیا ہے۔ اس تصویر میں بھوپال کی تاج المساجد اس طرح نمایاں طور پر ابھری ہوئی نظر آتی ہے جیسے کہ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے باغ میں یوکلپٹس کے دو اونچے درخت کھڑے ہوئے ہوں۔

بھوپال ایرپورٹ پر اترا تو وہاں دوسرے صاحبان کے علاوہ حضرت قبلہ پیر سعید میاں مجددی مدظلہ العالی بھی موجود تھے۔ یہ دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی۔ کیوں کہ وہ میرے لیے اور تمام لوگوں کے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واپسی کے وقت بھی وہ ازراہِ عنایت ایرپورٹ پر دوبارہ تشریف لائے۔ ان کی بزرگانہ حیثیت کی بنا پر میں زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھوپال میں میرا قیام بھی حضرت قبلہ مدظلہ العالی کی خانقاہ مجددیہ ہی پر رہا۔ دوران قیام کے تجربات اور فیوض کا کچھ تذکرہ اگلے صفحات میں درج ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک صاحب کا "سفرنامہ بھوپال" پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا: "شہر میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر دو بلند میناروں پر پڑتی ہے جو اس شہر کی عظمت اور وقار کے اکلوتے گواہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر ذہن میں اسلامی بھوپال کی تاریخ رقص کرنے لگتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاج المساجد کے دو مینارے شہر کے سب سے بلند عمارتی نمونے

ہیں۔ اپنی بلندی کے اعتبار سے وہ پورے شہر کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ مینارے بھوپال کے "اسلامی دور" میں نہیں بنے۔ وہ آزادی کے بعد اس کے سیکولر دور میں، یا زیادہ سخت الفاظ میں، اس کے "ہندو دور" میں بنائے گیے ہیں۔ اس لحاظ سے ان بلند میناروں کا اصل پہلو یہ نہیں ہے کہ وہ یہ یاد دلاتے ہیں کہ بھوپال کیا تھا، بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بھوپال کیا ہے۔ یہ مینارے ماضی کی یادگار کے طور پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ مسلمانوں کو علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ آج بھی اس ملک میں ان کے لیے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ وہ اپنی عظمت کا مینار بے روک ٹوک تعمیر کر سکیں۔ وہ حال کے امکان کو بتاتے ہیں نہ کہ صرف گزرے ہوئے ماضی کو۔

ایک صاحب جو شاعر ہیں، انھوں نے بھوپال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: شہر بھوپال کو یہ اعزاز میسر ہے کہ اس نے اپنے سینہ پر قیامت سے پہلے ایک قیامت جھیلی ہے۔ ایک زہریلی قیامت جو ایک ہی رات میں ہزاروں بے گناہوں کی دردناک موت کا سبب بنی اور لاکھوں لوگوں کو زہر آلود کر گئی۔ قدیم روایتوں اور تہذیب کے اس شہر نے جدید سائنسی دور کے اس تحفہ کو کمال تحمل سے اپنے سینہ پر جھیلا اور کسی سے شکوہ تک نہیں کیا"

مذکورہ صاحب کی مراد گیس کے اس حادثہ سے تھی جو بھوپال میں ۳ دسمبر ۱۹۸۴ کو پیش آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ نے صحیح فرمایا۔ مگر اس کلام میں "اعزاز" اور "جھیلا" جیسے الفاظ میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ اگر میں اس کو کہوں تو میں یوں کہنا پسند کروں گا کہ: اس شہر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے قیامت سے پہلے ایک قیامت کا تجربہ کیا۔

۲۸ نومبر کی شام کو ٹیگور ہال میں عمومی جلسہ تھا۔ علماء اور رہنماؤں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں تقریریں کی۔ تاہم سب کی تقریروں کا موضوع قرآن اور اس کی تعلیمات تھا۔ مسٹر روی پرکاش ماتھر (سابق وائس چانسلر بھوپال یونیورسٹی) بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر میں ان کی تقریر سن نہ سکا۔

میری تقریر کا عنوان قرآن کا عالمی پیغام تھا۔ میں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ عوام اور خواص سب نے اس سے غیر معمولی اتفاق کا اظہار کیا۔ جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ نے اس کو "آسمانی آواز"

قرار دیتے ہوئے اپنی زبان میں کہا : آکاشں وانی سے شبد بلیک بورڈ پر لکھے جارہے تھے اور ہم ان کو پڑھ رہے تھے ۔

دوسرے دن ۲۹ نومبر کی شام کو مجھے واپس آنا تھا۔ منتظمین کی فرمائش پر دوبارہ میں نے دس منٹ کی ایک مختصر تقریر کی ۔

ریاست کے ایک ہندو منسٹر (شیو بھانو سولنکی) نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کا مجھ کو ذاتی تجربہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام سے خود میرے گھر کو ایک فائدہ ہوا ۔ میرے ایک لڑکے نے انڈسٹری لگانا چاہا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی وہ میں نے ان کو دے دی ۔ مگر یہ رقم کم تھی ۔مزید سرمایہ فراہم کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کہا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گیے ۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں سود لینا حرام ہے۔ اس لیے میں رقم تو دوں گا، مگر سود نہیں لوں گا ۔ چنانچہ انھوں نے ہم کو بلا سودی قرض دے دیا۔ اگر میرا لڑکا بینک سے قرض لیتا تو اس کو کافی سود دینا پڑتا، مگر مسلمان کے ذریعہ اس کو سود کے بغیر قرض مل گیا ۔اس طرح خود میرے گھر نے اسلام کے ایک فائدہ کا تجربہ کیا۔

اسی طرح انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھ کو یہ بہت اچھی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ یہ بہترین یوگا ہے۔ اس سے آدمی کی عبادت بھی ہوتی ہے اور اس کا آسن بھی پورا ہو جاتا ہے۔ نماز سے وہ بھی ملتا ہے جو روح کو ملنا چاہیے اور وہ بھی ملتا ہے جو شریر کو ملنا چاہیے ۔

مذکورہ ہندو منسٹر کی تقریر سن کر میں نے سوچا کہ اس ملک میں اگر صرف اتنا کیا جائے کہ ہندو مسلمان زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہوں تو سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔ وہ کتنے نادان لیڈر تھے جنھوں نے ہندو مسلم مسئلہ کا حل دوری اور علٰحدگی میں سوچا۔ حالانکہ وہ قربت اور تعلق میں زیادہ بہتر طور پر موجود تھا ۔

دہلی کے کرنل نرائن صاحب نے ایک مرتبہ گفتگو میں یہ بات کہی تھی کہ ضرورت ہے کہ ایک تنظیم " فرینڈز آف اسلام سوسائٹی" کے نام سے بنائی جائے ۔ ہندستان کے اکثریتی فرقہ میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو بظاہر اگرچہ الگ مذہب رکھتے ہیں مگر انھیں اسلام سے گہری

دل چسپی ہے۔ ایسے تمام لوگ اس میں جڑ جائیں گے۔ اور اس طرح ایک بہت مفید اور دور رس کام کا آغاز ہو سکے گا۔

مذکورہ منسٹر صاحب کی تقریر سن کر مجھے خیال آیا کہ اس قسم کی تنظیم وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ " قرآن ہندی سوسائٹی آف انڈیا " میں ایک طرف اگر مولانا واجد الحسینی اور جناب فاروق ارگلی جیسے لوگ شریک ہیں تو اسی کے ساتھ اس میں شری رام سہائے یاتری جیسے لوگ بھی خلوص دل کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ سوسائٹی اگر " فرینڈز آف اسلام سوسائٹی " والے خواب کی تعبیر بن سکے تو یقیناً یہ ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اس اجتماع میں ملک کے مختلف حصوں سے علماء اور دانشور آئے تھے۔ سب نے راقم الحروف کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔ ایک مقرر (جناب جاوید حبیب صاحب) نے نہایت کھل کر الرسالہ کے نقطہ نظر کی تائید کی۔

محمد یوسف بھوپالی ندوہ سے فارغ ہیں اور اب حال میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ ایم اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے مجھے الرسالہ سے صرف جزئی دل چسپی تھی۔ مگر پچھلے دو سال سے میں نے الرسالہ کو اور آپ کی کتابوں کو غور کے ساتھ پڑھا۔ اب تو میں الرسالہ کا عاشق ہو گیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں الرسالہ ہی کا ایک مشن ہے جو خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

بھوپال کے ہندی اور اردو اخبارات نے ۲۸ نومبر کی تقریر کی نمایاں رپورٹ شائع کی۔ روزنامہ افکار (۲۹ نومبر ۱۹۸۷) کے صفحہ اول پر اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کا عنوان انھوں نے ان الفاظ میں قائم کیا تھا :

عہد جدید کی ترقیات کا سہرا حاملینِ قرآن کے سر ہے

اصل تقریر کی رپورٹ تو بڑی حد تک صحیح تھی، مگر اس کی مذکورہ سرخی تقریر کی اصل روح کے مطابق نہ تھی۔ اگر میں خود اس کی سرخی قائم کرتا تو اس کے الفاظ یقیناً دوسرے ہوتے۔ کیوں کہ اس سرخی میں قومی فخر کی نفسیات جھلک رہی ہے۔ جب کہ میں نے اپنی تقریر میں اصلاً قرآنی تعلیمات کی عظمت کو بیان کیا تھا نہ کہ کسی قوم کے شاندار کارناموں کو۔

افکار کے ہندی اڈیشن میں نسبتاً زیادہ بہتر رپورٹنگ نظر آئی۔

خانقاہ مجددیہ میں بہت قدیم سے یہ روایت ہے کہ ہر اتوار کو ۱۲ بجے دن میں ایک مجلس ہوتی ہے۔ اس مجلس کو پہلے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ خطاب فرمایا کرتے تھے اب ان کے جانشین حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ اس سے خطاب فرماتے ہیں۔ ۲۹ نومبر کو اتوار تھا۔ چنانچہ حسب معمول لوگ کافی تعداد میں جمع ہوگیے۔ حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ کے حکم سے میں نے اس مجلس میں ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تعلق باللہ تھا۔ میں نے اپنی ایک گھنٹہ کی تقریر میں شکر اور عبادت کی حقیقت بیان کی۔ اس کا اور دوسری تقریروں کا ٹیپ بھوپال کے بعض اصحاب کے پاس موجود ہے۔

۲۹ نومبر کو نماز ظہر کے بعد قدسیہ بیگم کی مسجد میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں الرسالہ کے قارئین اور شہر کے باشعور مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ —— اس ملک میں مسلمانوں کا المیہ، ایک لفظ میں یہ ہے کہ مسلمان پانے سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں زندگی کا راز یہ ہے کہ کھونے سے آغاز کیا جائے۔

کھیت سے فصل لینے کے لیے پہلے اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ دکان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے سرمایہ کو دکان میں لگا دینا پڑتا ہے۔ ایک رہائشی مکان کا مالک بننے کے لیے پہلے یہ کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اینٹوں کو بنیاد میں دفن کر دیا جائے۔ یہ اس دنیا میں زندگی کا قانون ہے۔ مگر مسلمان اس قانون الٰہی کو الٹی طرف سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کھوئے بغیر پائیں اور دیئے بغیر حاصل کریں، تو مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا کبھی ہونے والا نہیں۔ مسلمان اپنی اس الٹی جدوجہد میں آزادی کے بعد چالیس سال ضائع کر چکے ہیں۔ اگر وہ مزید چالیس ہزار سال تک اپنی یہ الٹی کوشش جاری رکھیں تب بھی انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ تقریر میں اس نقطۂ نظر کو حوالوں اور مثالوں سے واضح کیا گیا۔

بھوپال میں میرا قیام خانقاہِ مجددیہ میں تھا۔ حضرت مولانا پیر سعید میاں صاحب مجددی کے روحانی فیض اور بابرکت کلمات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے بہت سے نہایت قیمتی ملفوظات سنائے۔ ایک ملفوظ یہ تھا:

"یہ طبی اصول ہے کہ جب مرض شدید ہو جاتا ہے تو علاج پہلے ہلکی دوا سے شروع کیا جاتا ہے کیوں کہ مرض کی شدت کا اثر دل، دماغ اور اعضائے رئیسہ پر بھی ہوتا ہے اس لیے اگر علاج میں تیز دوا دیدی جائے تو دل، دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ پر ناقابل برداشت اثر مرتب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہذا علاج ہلکی دوا سے شروع کیا جاتا ہے پھر حسب ضرورت بتدریج دوا کو تیز کیا جاتا ہے۔ یہی طبی اصول ہے۔

اسی طرح اصلاح نفس میں بھی یہ اصول قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اگر فساد نفس شدید ہو اور طغیانی کی حد تک پہونچ گیا ہو تو طریقۂ اصلاح نرم انداز میں شروع کرنا چاہیے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید سے حاصل ہو رہا ہے ارشاد خداوندی ہے کہ: اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۴۴) تم دونوں (موسیٰ و ہارون) فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ سرکشی پر پہونچ گیا ہے۔ پس اس سے نرم بات کہنا تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا اللہ سے ڈرے۔"

یہ اصلاح کی لازمی شرط ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کے لیے صبر و برداشت کی بے پناہ مقدار درکار ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے صبر کی متاع کھو دی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے "فراعنہ" کے مقابلہ میں اس اصول کو استعمال نہیں کر پاتے۔

حضرت مولانا نے حضرت شاہ رؤف احمد صاحب (۱۲۵۳ – ۱۲۰۱ھ) کی فارسی کتاب "ارکان اسلام" کا ایک صفحہ بتایا جو کہ حسب ذیل تھا:

بزرگے فرمودہ است کہ چہار ہزار اشتر کتاب خواندیم واز آنجملہ چہار سخن اختیار کردیم۔ یکے آنکہ اے نفس آنچہ ترا حق تعالیٰ منع کردہ است از آں باز آ و الّا از ملک او بدر شو۔ دوم آنکہ اے نفس اگر طاعت او میکنی بکن و الّا روزیٔ او مخور۔ سوم آنکہ اے نفس بر قسمت خویش راضی باش و الّا خدائے دیگر طلب کن تا ترا بیشتر دہد۔ چہارم آنکہ اے نفس اگر قصد گناہ داری اوّل جائے بہم رساں کہ ترا حق تعالیٰ نہ بیند و الّا مکن۔

ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ چار ہزار اونٹ کے بوجھ کے برابر میں نے کتابیں پڑھیں اور ان سے میں نے چار باتیں حاصل کیں۔ ایک یہ کہ اے انسان، اللہ نے تجھ کو جس چیز سے منع کر دیا ہے

اس کو نہ کر، ورنہ تو اس کے ملک سے باہر چلا جا۔ دوسرے یہ کہ اے انسان، اگر تو اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو کر، ورنہ اس کا رزق نہ کھا۔ تیسرے یہ کہ اے انسان، اپنی قسمت پر راضی ہو جا، ورنہ اپنے لیے دوسرا خدا حاصل کر تاکہ وہ تجھ کو زیادہ دے۔ چوتھے یہ کہ اے انسان، اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا تجھ کو نہ دیکھے ورنہ گناہ نہ کر۔

انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو وہ خدا کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

جلسہ میں شرکت کے بعد میں اپنی قیام گاہ (خانقاہ مجددیہ) واپس آچکا تھا کہ اچانک ایک صاحب آئے۔ بظاہر وہ بالکل سیدھے سادے قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک بند کاغذ دیا اور اس کے بعد فوراً واپس چلے گیے۔ انھوں نے نہ مزید کچھ کہا اور نہ وہاں ٹھہرے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کاغذ کو کھولا تو اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف سے سلام قبول ہو"

اوپر میں نے جو کچھ نقل کیا، اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم ہے۔

ایک صاحب ملے۔ انھوں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اس کے بعد انھوں نے عام طرز کی لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں اور دیر تک بولتے رہے۔ میں نے کہا: آپ الرسالہ کے قاری نہیں ہیں۔ آپ نے ابھی وہ چیزیں پڑھی ہیں جو آدمی کو بولنے والا بناتی ہیں۔ الرسالہ کا قاری تو وہ ہے جس پر چپ لگ جائے، جو الرسالہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، اور اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں۔

ایک مجلس میں اسلامی دعوت پر گفتگو تھی۔ میں نے کہا کہ اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ہمارا تعلق دوسری قوموں سے داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ نہ کہ حریف اور رقیب کا تعلق۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ آج کل تو سبھی لوگ دعوت اور داعی اور مدعو کی بات کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دعوت کسی تقریری مظاہرہ کا نام نہیں۔ دعوت ایک سنجیدہ ترین عمل ہے۔ دعوت کی اصل بندوں کی خیر خواہی ہے ——— مدعو کو محبوب بنانا پڑتا ہے

اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

یہاں جن صاحبان سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک مسٹر راج تیواری ہیں۔ وہ پابندی سے الرسالہ انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ نے تو مجھ کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو آپ ایک آدمی نہ سمجھیے۔ میرے جیسے بے شمار لوگ ہیں جو کسی سچے پیغام کے منتظر ہیں۔ بس آپ سیٹی بجا دیجئے، اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہاں مسافروں سے لدی ہوئی ایک پوری گاڑی چل پڑی ہے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کسی بات کو واقعی طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پیشگی طور پر کچھ باتوں کو جانتا ہو۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ "میں دہلی سے آیا ہوں" تو آپ کو پہلے سے اس کا علم ہونا چاہیے کہ "دہلی" کیا ہے۔ اگر آپ "دہلی" سے واقف نہ ہوں تو آپ میرے جملہ کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

بھوپال کا سفر مختصر ہونے کے باوجود خدا کے فضل سے کافی مفید رہا اور اس کا کریڈٹ تمام تر ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کو جاتا ہے۔ وہ دس برس سے پابندی کے ساتھ الرسالہ کو پھیلا رہے ہیں۔ اور انھوں نے تقریباً پورے بھوپال کے لوگوں کو الرسالہ کے مشن سے متعارف کرادیا ہے۔ چنانچہ میں بھوپال پہنچا تو وہاں وہ ذہنی پس منظر پوری طرح موجود تھا جو الرسالہ والی بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس چیز نے بھوپال کے سفر کو توقع سے زیادہ کامیاب بنا دیا۔ فللہ الحمد۔

ایک صاحب نے اخبار ریڈینس (۲۹ نومبر ۱۹۸۷) پیش کیا اور کہا کہ دیکھئے خود مسلمان ہی اسلام کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، پھر ہم غیروں سے کیا امید کر سکتے ہیں۔ اس اخبار کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ جموں اور کشمیر کے مسلم وزیر اعلیٰ اسلام دشمن ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کشمیر میں اسلام پسند جماعت نے ایک سو سے زیادہ اسلامی اسکول قائم کر رکھے ہیں اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان کو طاقت سے بند کر دینا چاہتے ہیں:

The Chief Minister has received his anti-Islamic legacy from his late father who struck a deadly blow to the Islamic education in 1975.

میں نے کہا کہ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر ہے۔ اور اسی غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر

نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے: تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) مذکورہ واقعہ میں بھی اس کا ایک ضد پایا جاتا ہے۔ آپ اس کے ضد کو ملا کر دیکھیے، اس کے بعد ہی آپ اس معاملہ میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ ایک طرف یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اسلام پسند جماعت کے اسلامی اسکولوں کو بند کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سامنے یہ واقعہ آتا ہے کہ یہی ڈاکٹر فاروق عبداللہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جاتے ہیں اور وہاں وہ یونیورسٹی کے لیے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کے عطیہ کا اعلان کرتے ہیں۔ تاکہ غریب مسلم طلبہ کو مدد دے کر انھیں تعلیم میں آگے بڑھایا جاسکے (اخبار نو ۵ نومبر ۱۹۸۷)

اب سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی شخص کیوں ایسا کرتا ہے کہ ایک طرف وہ کشمیر کی "اسلامی درسگاہ" کو کچلنا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہی شخص علی گڑھ کی "اسلامی درسگاہ" کی ترقی کے لیے گراں قدر مستقل رقم پیش کر رہا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ علی گڑھ کی اسلامی تعلیم گاہ اس کی سیاسی حریف نہیں۔ جب کہ کشمیر کی اسلامی تعلیم گاہ ریاست کے الیکشن ۱۹۷۵ اور اس کے بعد موجودہ الیکشن (مارچ ۱۹۸۷) میں اس کی سیاسی مخالفت کا اڈا بنی رہی۔

یہ عین وہی چیز ہے جس کی روایت سب سے پہلے اس ملک میں اس شخص نے قائم کی جس کو آپ سب لوگ "عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ" کہتے ہیں۔ اورنگ زیب عالم گیر نے کچھ عبادتخانوں کو جاگیریں دیں اور دوسرے عبادتخانے ایسے بھی ہیں جن کو اس نے ڈھا دیا۔ اس فرق کا سبب یہی تھا کہ جو عبادتخانہ صرف عبادتخانہ تھا، اس کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر نے تعاون کا معاملہ کیا۔ اور جو عبادتخانہ اس کی سیاسی مخالفت کا اڈہ بنا ہوا تھا اس کو اس نے منہدم کرا دیا۔

اس دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے حریفوں کو نہیں بخشتا، خواہ وہ سیکولر قسم کے لیڈر ہوں یا مقدس اسلامی رہنما۔ جو لوگ اس دنیا میں کوئی واقعی کام کرنا چاہتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ سب سے پہلے زندگی کی اس حقیقت کو جانیں، اس کے بعد وہ میدان عمل میں اپنا قدم رکھیں۔

جناب سلیم شمسی صاحب (پیدائش ۱۹۴۲) نے بتایا کہ جس زمانہ میں جن سنگھ کو ختم کر کے بھارتیہ جنتا پارٹی بنائی گئی تھی اٹل بہاری باجپئی مسلم موافق تقریریں کرنے لگے تھے۔ سلیم شمسی صاحب نے ان سے ایک

ملاقات کے دوران کہا کہ پہلے تو آپ مسلم مخالف تقریریں کرتے تھے۔ اب آپ کا لہجہ بدل گیا ہے۔ شاید آپ نے مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے اس کو سن کر کہا :

"میاں، آدمی نہیں بولتا، پلیٹ فارم بولتا ہے"

اٹل بہاری باجپئی کے اس جواب پر ایک تاثر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بے اصول سیاست یا زیادہ سخت لفظوں میں منافقت ہے۔ مگر میں نے اس کو سنا تو میرے دل نے کہا کہ ہم کو انسان کی اس کمزوری کو مانتے ہوئے یہ کرنا چاہیے کہ ایسا "پلیٹ فارم" وجود میں لائیں جہاں آدمی ہمارے موافق بولنے پر مجبور ہو جائے۔

اس بات کی ایک دلچسپ مثال اسی جلسہ میں شیعہ رہنما جناب پرنس انجم قدر صاحب نے پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہمارے شہر میں ایک مشہور سنی عالم آئے۔ ہم نے ان کو اپنے امام باڑہ میں بلا کر استقبالیہ دیا اور ان سے تقریر کرائی۔ وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اس حدیث کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا: تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي۔ اور اہل بیت کی فضیلت پر شاندار تقریر کی۔ اس سنی عالم کے شہر والے شیعہ حضرات کو معلوم ہوا تو انھوں نے پرنس انجم قدر صاحب سے کہا کہ یہ سنّی عالم ہمارے یہاں تو دوسرے قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ پرنس انجم قدر نے جواب دیا : تم ان کے ساتھ جیسا کرتے ہو ویسا وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں، ہم نے ان کے ساتھ جیسا کیا ویسا انھوں نے ہمارے ساتھ کیا (واضح ہو کہ سنی علماء کے نزدیک زیادہ صحیح اور مستند روایت وہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں : تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُولِهِ)

سبق آموز

۳۱ اگست ۱۹۸۷ کی صبح کو تمام اخبارات یہ خبر لے کر آئے کہ ہرجندر سنگھ جندا اور ستنام سنگھ باوا کو دہلی میں گرفتار کر لیا گیا۔ جندا پنجاب کے انتہائی خطرناک دہشت پسندوں میں سے تھا۔ وہ خالصتان کمانڈو فورس میں "جنرل" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے جنرل ویدیہ، للت ماکن ایم پی، ارجن داس کونسلر، کئی پولس افسر اور بیسیوں دوسرے افراد کو قتل کیا تھا۔ پنجاب نیشنل بنک لدھیانہ میں پانچ کرور روپیہ سے زیادہ کی ڈکیتی میں اسی کا ہاتھ تھا۔ وغیرہ۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے نہایت خطرناک ہتھیار، پانچ لاکھ روپے نقد، بہت سا سونا اور دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس گرفتاری کے ذیل میں بہت سی تفصیلات اخباروں میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک جزء یہ تھا کہ :

> The police found in Jinda's pocket some powder which they suspect is cyanide. Jagdish Singh had swallowed cyanide when he was taken to the police post at Paharganj. If Jinda had died, it would have robbed the police of a chance to interrogate him and obtain vital information (p.3).

پولس نے نہایت صحیح وقت پر اس کو پکڑ لیا۔ کیوں کہ یہاں ایک اور خطرہ تھا۔ جندا خودکشی کر سکتا تھا جیسا کہ جگدیش سنگھ زیلا والا نے دو سال پہلے کیا تھا۔ پولیس کو جندا کی جیب میں کچھ سفوف ملا ہے جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ سائنائڈ زہر ہے۔ جگدیش سنگھ نے اس وقت سائنائڈ کھا لیا تھا جب کہ وہ پہاڑ گنج کی پولیس چوکی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اگر جندا مر جاتا تو پولیس کے لیے یہ موقع ختم ہو جاتا کہ وہ اس سے سوالات کرے اور اہم معلومات حاصل کرے۔ (انڈین اکسپریس یکم ستمبر ۱۹۸۷)

دہشت پسند تنظیم کا کوئی شخص اگر زندہ حالت میں پولیس کے قبضہ میں چلا جائے تو پولیس اس پر ناقابل برداشت سختیاں کر کے اس سے تمام راز اگلوا سکتی ہے، اور پھر پوری تنظیم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں دہشت پسند فوراً خودکشی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا وجود مٹا دیتا ہے تاکہ اپنی تنظیم کے وجود کو بچا سکے۔

یہی قربانی جماعتوں کی زندگی کی ضمانت ہے، خواہ وہ تخریبی جماعت ہو یا تعمیری جماعت۔
موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کے تقاضے اور جماعت کے تقاضے میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے کو "ہلاک" کرلے تاکہ جماعت کو زندگی حاصل ہو سکے۔

تاہم جسمانی قتل اس قربانی کی سب سے چھوٹی صورت ہے۔ اس راہ کی زیادہ بڑی قربانی وہ ہے جس کو حیاتی قتل یا نفسیاتی ہلاکت کہا جا سکتا ہے۔ پہلا اگر جہادِ اصغر ہے تو دوسرا جہادِ اکبر۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی انا کو چوٹ لگتی ہے۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر منفی جذبات کو جگا دیتے ہیں۔ وہ اتحاد کے بجائے اختلاف کی باتیں سوچنے لگتا ہے۔

ایسے تمام مواقع پر اس کو وہی کام کرنا ہے جو دہشت پسند تنظیم کا ایک ممبر کرتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ دہشت پسند تنظیم کا ممبر اپنے جسم کو قتل کرتا ہے، مگر تعمیری اجتماعیت کے رکن کو ایسے موقع پر اپنے احساس کو قتل کرنا ہے۔ اس کو اپنی منفی نفسیات کو پوٹاشیم سائنائڈ کی خوراک کھلانا ہے۔

جس اجتماعیت کو ایسے افراد مل جائیں، اس کو دنیا کی کوئی رکاوٹ کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

اجتماعیت کو زندگی دینے کے لیے انفرادی نفسیات کا یہ قتل ہر حال میں ضروری ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کے زمانہ کی اجتماعیت بھی اس ناگزیر قربانی کے بغیر قائم نہیں ہو سکی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے مقدس ساتھیوں نے بار بار اس قسم کی نفسیاتی خودکشی کی قربانی دی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ عرب میں وہ طاقت ور اجتماعی ہیئت ظہور میں آئی جو سارے عالم کی قسمت بدل دے، اور انسان کو ایک نئے تاریخی دور میں داخل کر دے۔
فرد کی ہلاکت پر اجتماع کو زندگی ملتی ہے، اجتماع کی زندگی کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔

۱۔ حیدر آباد کی سالانہ نمائش کے موقع پر فروری ۱۹۸۸ میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کا بک اسٹال لگایا گیا۔ اس کا اسٹال نمبر ۲۷ - ۱۷۴ تھا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں الرسالہ کی خریداری قبول کی اور کتابیں حاصل کیں۔ یہ اسٹال اسلامی مرکز کے مشن کے مزید وسیع پیمانہ پر تعارف کا ذریعہ بنا۔ اس اسٹال کا اہتمام الرسالہ اکیڈمی حیدر آباد کی طرف سے کیا گیا تھا۔

۲۔ بھوپال میں ۲۶-۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ کو تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر مقامی حلقہ کی طرف سے اسلامی مرکز کا اسٹال لگایا گیا جس میں تمام کتابیں رکھی گئیں۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں آکر معلومات کیں اور کتابیں حاصل کیں۔ اس کے علاوہ متعدد دوسرے اسٹالوں پر بھی مرکز کی کتابیں موجود تھیں وہاں سے بھی لوگ کتابیں حاصل کرتے رہے۔ بیک وقت کئی مکتبوں پر مرکز کی کتابوں کا رکھا جانا اس کی عوامی طلب میں اضافہ کا ثبوت ہے۔

۳۔ محمد عابد شاہ صاحب نے "اخبار اردو" کے لیے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ انٹرویو میں اسلامی مرکز کے مشن کے علاوہ مسلمانوں کے مسائل زیر گفتگو آئے۔ یہ انٹرویو اخبار اردو کے شمارہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ میں شائع ہوا ہے۔

۴۔ مسٹر آر بی ایل نگم دہلی کے ایک جرنلسٹ ہیں جو مختلف ہندی اور انگریزی اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے معاملات و مسائل تھے۔

۵۔ امراؤتی یونیورسٹی (مہاراشٹر) نے بی اے فائنل (اردو) کے کورس کے لیے "انتخاب اردو" کے نام سے ایک کتابی سلسلہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے تیسرے حصہ میں الرسالہ جنوری ۱۹۸۴ کے ایک مضمون کو مکمل طور پر شامل گیا ہے۔ یہ مضمون "ایٹمی ہلاکت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ واضح ہو کہ امراؤتی یونیورسٹی کے تحت اس وقت چار اضلاع میں ۸۰ کالج چل رہے ہیں۔

۶۔ نئی دہلی میں آٹھویں عالمی کتابی نمائش ۵ فروری سے ۱۵ فروری ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس

نمائش میں ہندستان کے علاوہ ۵۷ دوسرے ملکوں نے حصہ لیا اور مجموعی طور پر سات سو ناشرین اور کتب فروشوں نے اپنے اسٹال لگائے۔ اس موقع پر مکتبہ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کا بھی اسٹال لگایا گیا۔ لوگ کثیر تعداد میں آئے اور گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

۷۔ الرسالہ ریڈرس سرکل دہلی کی طرف سے ۳۰ جنوری ۱۹۸۸ کی شام کو غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس کے صدر جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔ پورا ہال نیچے سے اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ شہر کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کثیر تعداد میں شریک ہوا۔ اور مسٹر جاوید حبیب نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیے۔

۸۔ مسلسل اطلاعات مل رہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا مشن اب خدا کے فضل سے عمومی تائید کے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ لوگ فساد کو روکنے کے لیے الرسالہ میں بتائی جانے والی حکیمانہ تدبیر کو اختیار کر رہے ہیں۔ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ میں شائع شدہ مضمون "آزمودہ حل" کو بہت سے اخبارات و رسائل نے نقل کیا۔ مختلف لوگ الرسالہ کے حوالہ کے بغیر الرسالہ والی بات کو دہرا رہے ہیں۔ روزنامہ قومی آواز (۵ جنوری ۱۹۸۸) نے "ضرورت ہے نئی قیادت کی" کے زیر عنوان ایک مفصل مضمون نمایاں طور پر شائع کیا ہے جس میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کی صد فی صد تائید کی گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۹۔ الرسالہ کا مشن الحمد للہ خاموشی کے ساتھ صالح ذہن بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک خط کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک نوجوان لکھتے ہیں: میں کالج کے میدان میں کچھ لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہم عمر بھائی نے مجھے بھری محفل میں بے عزت کر دیا۔ حالاں کہ میں نے کوئی ناشائستہ لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ مگر اچانک وہ اتنا ترش ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گیے۔ میں ایک لفظ نہیں بولا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعہ کے دو دن بعد وہ نوجوان دوبارہ مجھ سے ملا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا کہ غلطی اسی کی تھی۔ بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ میں نے صبر کے ذریعہ اس نوجوان

کے دل و دماغ پر فتح پائی۔ یہی وہ پیغام ہے جس کی تلقین آپ اپنی اعلیٰ تحریروں میں کرتے ہیں آپ کی کتابوں نے میرے ذہن کو حقیقت پسند بنا دیا۔ اور میری زندگی کا نیا دور شروع ہوگیا۔ اب میں کہوں کہ میں نے از سر نو زندگی کا آغاز کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ (الطاف حسین شاہ کشمیر)

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۲ فروری ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کے ذریعہ آپ قوم کو جو پیغام دے رہے ہیں وہ بہت تعمیری اور مثبت ہے۔ الرسالہ کے مطالعہ نے میری زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا کی ہے۔ پہلے میں مسلمانوں کی حالت زار کے لیے اکثریتی فرقہ اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور اس کے لیے فریق ثانی سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جس سے ہر وقت میں انتہا پسندی اور جذباتیت کا شکار رہتا تھا۔ اب میں مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار کو خود مسلمانوں کی غفلت، کوتاہی اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ مانتا ہوں جس سے مجھ میں جوش کی جگہ ہوش اور شکایت کی جگہ عمل کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔ (عفران الحق، نالندہ)

۱۱۔ ایک صاحب "تعبیر کی غلطی" کا مطالعہ کرنے بعد لکھتے ہیں: میں نے اسلام کی انقلابی تشریح کا جو تصور اپنے ذہن میں بنایا تھا، آج اس کتاب (تعبیر کی غلطی) کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ۲۵ سالہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اب میں نئی عمارت بنانے کی کھوج میں از سر نو منہمک ہوگیا ہوں (ہاشم، بنگلور)

۱۲۔ ایک نئی کتاب چھپنے کے لیے پریس میں بھیجی گئی ہے۔ اس کا نام "میوات کا سفر" ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے پچھلے ۲۰ برسوں میں میوات کے علاقہ کے بہت سے سفر کیے تھے۔ ان کے سفرنامے بھی پہلے شائع ہوئے تھے۔ اب ان تمام مضامین کو یکجا کر کے "میوات کا سفر" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ پوری کتاب سبق اور نصیحت کی باتوں سے اور مختلف قسم کے تجربات سے بھری ہوئی ہے۔ میوات کا سفر ایک اعتبار سے پوری ملتِ اسلامیہ ہند کا مطالعہ ہے۔

۱۳۔ اسلامی مرکز ایک دینی اور تعمیری ادارہ ہے۔ اسلامی مرکز کے ساتھ تعاون کرنا دینی دعوت اور تعمیری مہم میں تعاون کرنا ہے۔ آپ کا ہر قسم کا تعاون شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اپنی رقوم بھیجتے ہوئے مد کی ضرور صراحت فرما دیں۔

The best and simplest way of serving AL-RISALA cause is to take on an agency of it.

AL-RISALA represents a mission, the aims and objectives of which are to proclaim a divine message. It is a voluntary effort, which belongs to everyone who is in accord with the message it proclaims. Such people are invited to join us in this divine cause. and assist in conveying the truth to those around them.

The best and simplest way of serving the AL-RISALA cause is to take on an agency of the magazine. The more people who do this, the wider the area over which the message will be disseminated.

An AL-RISALA agency will be alloted on the basis of at least five copies. Packing and forwarding charges will be borne by the office. Commission will be at the rate of 25%. If the number of copies exceeds one hundred, the rate of commission will be 33%. (Price per copy Rs. 4).

Please note that small numbers of copies cannot be posted by VPP every month due to high postage rates. We would appreciate it if payments, in such cases, are made by money-order or draft in the name of AL-RISALA Monthly, either in advance or after the receipt of the magazine.

Where this is not possible, we can send the magazine by Book Post every month and recover the amount due on them by VPP once every few months, the interval being dependent upon the number of copies dispatched.

God has entrusted YOU with a message to be communicated to the rest of the world. Are you ready to fulfill that trust?

THE CIRCULATION DEPARTMENT
AL-RISALA MONTHLY
C-29, Nizamuddin West
New Delhi-110013, INDIA.
Tel: 697333, 611128

جلد دوم تیار

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قران کی کنجی ہے۔

RN 28822/76 D(SE) 243 April 1988 No 137

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4